یکم اکتوبر ۲۰۲۱ء | بسم اللہ الرحمٰن الرحیم | جلد نمبر: ۱۴ ۔ شمارہ نمبر: ۱۸

پندرہ روزہ
معارف فیچر کراچی
MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، سید سمیع اللہ حسینی، نوید نون ۔ معاون مدیران: غیاث الدین، محمد عبید فاروقی

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰
فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱۔۳۶۳۴۹۸۴۰ (۹۲۔۲۱)
برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi. REG.No.SC-1303

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے' جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلاتبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔کسی مضمون' نقطہء نظر' خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں' اس کی اہمیت ہوتی ہے۔کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جاسکتی ہے۔

۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

۴ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید' لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

''کواڈ'' چین کے لیے خطرے کی گھنٹی

Kevin Rudd

۲۰۱۷ء میں جب جاپانی وزیر اعظم شانزو ایب نے بھارت، آسٹریلیا اور امریکا کے حکام کو منیلا میں ملاقات کی دعوت دی تو اس خبر میں ایسا کچھ نہیں تھا جو چین کے لیے پریشانی کا باعث بنتا۔اس وقت چینی وزیر خارجہ Wang Yi نے طنز کرتے ہوئے اس محفل کے بارے میں کہا تھا کہ ''QUAD (اس گروپ کو ''کواڈ'' کا نام دیا گیا تھا) کا یہ اجتماع صرف ذرائع ابلاغ میں سرخیوں میں آنے کی ایک کوشش ہے'۔ان کا کہنا تھا کہ ''یہ بحر اکاہل یا بحر ہند کی اس جھاگ کی طرح ہے جو توجہ چاہتی ہے لیکن پھر خود بخود بیٹھ جاتی ہے''۔ایسا بیان دینے کے لیے بیجنگ کے پاس ٹھوس وجہ بھی تھی۔چینی ماہرین کا خیال تھا کہ ''کواڈ'' کے ارکان ممالک کے مفادات ایک دوسرے سے بہت زیادہ متصادم ہیں اس لیے ان سب کا کسی مشترکہ حکمت عملی یا منصوبہ بندی تک پہنچنا تقریباً ناممکن ہے۔ویسے بھی اس طرح کے اتحاد کا تجربہ ایک دہائی قبل بھی کیا جا چکا ہے جس کے کوئی خاطر خواہ نتائج سامنے نہیں آئے تھے۔

تاہم نومبر ۲۰۱۷ء کے اس اجتماع کے چند سالوں میں ہی چین کو اپنے پہلے بیانات پر از سر نو غور کرنا پڑا۔اس سال مارچ میں جب ''کواڈ ممالک'' کے سربراہان سطح کا پہلا اجلاس منعقد ہوا اور اس کی پریس ریلیز جاری کی گئی تب سے چینی حکام نے اس اتحاد کو تشویشی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا۔اس سربراہی اجلاس کے بعد چینی ماہرین نے یہ اخذ کیا کہ آنے والے سالوں میں چینی عزائم کے سامنے یہ اتحاد ایک چیلنج کے طور پر سامنے آئے گا۔

چین کے ساتھ ''تزویراتی مقابلہ'' واشنگٹن میں ایک ایسا ایشو بن گیا ہے، جس پر وہاں کی دونوں سیاسی جماعتیں ایک جیسا مؤقف رکھتی ہیں، اور وہاں کی دونوں جماعتوں میں بہت کم ہی کسی ایشو پر اتفاق رائے ہو پاتا ہے۔اس خطرے کو بھانپتے ہوئے چینی صدر نے کہا تھا کہ ''مستقبل کے عالمی نظام میں چینی بالادستی کے لیے اگر ہمیں کسی سے مقابلہ کرنا ہوگا تو وہ امریکا ہوگا، کیوں کہ امریکا چینی بالادستی کی راہ میں رکاوٹ بنے گا''۔صدر ژی کا خیال ہے کہ اب سے لے کر ۲۰۳۵ء تک چین کے پاس یہ موقع ہے کہ وہ معاشی، ٹیکنالوجی اور فوجی لحاظ سے دنیا کے تمام ممالک سے آگے نکل جائے۔اس کے لیے وہ خاص طور پر ایشیائی ممالک پر زور ڈال رہا ہے کہ ''دنیا میں چینی بالادستی اب یقینی ہے اور ان کے لیے اس کے علاوہ کوئی دوسرا آپشن نہیں کہ وہ چینی مطالبات کو تسلیم کریں''۔اس سے چین بغیر گولی چلائے عالمی نظام کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے کے قابل ہو جائے گا اور بغیر گولی چلائے وہ دنیا میں قائدانہ کردار سنبھال لے گا۔

چین کی نظر میں ''کواڈ'' کی اہمیت اس لیے بڑھ رہی ہے کیوں کہ یہ واحد اتحاد ہے جو چین کے خلاف مزاحمت کرنے والے تمام ممالک کو ایک ساتھ جمع کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ چینی حکام اس اتحاد کے مقاصد اور پیش قدمی میں رکاوٹ ڈالنے کی بھرپور جدوجہد کر رہے ہیں۔اور چین کو لگتا ہے کہ اگر یہ اتحاد کامیاب ہوا تو ہماری بالادستی کی جدوجہد میں خلل ڈالنے کا باعث بنے گا۔

ساتھ مل کر:

جاپانی وزیر اعظم ایب نے ''کواڈ'' لانچ کرنے کی پہلی کوشش ۲۰۰۴ء میں کی تھی، جب آسٹریلیا، بھارت، امریکا اور جاپان نے مل کر سونامی جیسی آفت سے نمٹنے کے لیے کوششیں کی تھیں۔ایب نے چاروں ممالک کی مشترکہ سکیورٹی چیلنجز سے نمٹنے کے لیے مل کر کام کرنے کی صلاحیت میں اضافہ کے لیے کواڈ کے قیام کا آئیڈیا پیش کیا تھا۔تاہم بقیہ دارالحکومتوں نے کسی خاص گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کیا۔

امریکی صدر جارج بش کو خدشہ تھا کہ ایک ایسے وقت میں جب دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اسے چین کی ضرورت ہے، اس اقدام سے چین اپنے آپ کو تنہا محسوس کرے گا اور ہو سکتا ہے کہ جواب میں وہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں تعاون سے پیچھے ہٹ جائے۔اس کے کچھ ہی عرصے بعد جب وکی لیکس سامنے آئیں تو اس میں پتا چلا کہ امریکی انتظامیہ کی طرف سے خفیہ طور پر علاقائی طاقتوں کو یہ یقین دلایا گیا تھا کہ ''کواڈ'' کبھی حقیقت کا روپ نہیں دھار سکے گا۔دہلی میں من موہن سنگھ نے ''کواڈ'' سے کسی بھی قسم کے فوجی تعاون کو خارج از امکان قرار دے دیا، کیوں کہ بھارت کا خیال تھا کہ چین سے بہتر تعلقات ہماری ضرورت ہیں۔ادھر کینبرا میں جان ہارورڈ کی قدامت پسند حکومت

اندرونی صفحات پر:۔

- خلیجی ریاستیں افغانستان سے سبق سیکھ سکتی ہیں؟
- خوراک کا ضیاع حقیقی بحران
- سی آئی اے کا نیا بحران
- نیا افغانستان: بھارت کے لیے شدید دھچکا
- حقیقی عالمگیریت کی طرف

ہماری ویب گاہ دیکھیے: irak.pk

نے چین کے ساتھ فائدہ مند معاشی تعلقات کی بنیاد پر ایسے کسی بھی اقدام کی مخالفت کردی اور آسٹریلیا نے تو سہ فریقی اتحاد میں بھارت کی شمولیت کی بھی کھل کر مخالفت کی۔ جنوری ۲۰۰۷ء میں آسٹریلیا نے سرکاری طور پر بیجنگ میں اس اتحاد سے علیحدگی کا اعلان کردیا۔ اس اتحاد کے بانی شانزو ایب نے جب نومبر ۲۰۰۷ء میں غیر متوقع طور پر اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا تو ان کے جانے کے ساتھ ہی ''کواڈ'' کا آئیڈیا اپنی موت آپ ہی مرگیا۔ جب ایک دہائی بعد ایب نے ان ممالک کو دوبارہ اکٹھا کیا تو اس وقت تک تزویراتی حالات میں ڈرامائی تبدیلیاں رونما ہوچکی تھیں۔ سالہا سال سے امریکا چین بڑھتی ہوئی کشیدگی، جنوبی اور مشرقی چین کے سمندروں میں چین کا آمرانہ رویہ اور چین اور بھارت کے مابین متنازع زمین پر بار بار کی جھڑپوں نے ان ممالک کے دارالحکومتوں میں چین کے خلاف تزویراتی حکمت عملی کے حوالے سے کان کھڑے کردیے تھے۔ تاہم بیجنگ کا اب بھی خیال تھا کہ متضاد مفادات کی وجہ سے یہ ممالک اکٹھے نہیں ہوسکیں گے۔ حالاں کہ ''کواڈ'' ممالک کے سفارتکاروں نے ''ایسٹ ایشیا'' کانفرنس کے موقع پر ایک میٹنگ کی، جس کی کوئی مشترکہ پریس ریلیز تو جاری نہ کی جاسکی، تاہم سب سفارت کاروں نے اپنے اپنے بیانات دیے اور کہا کہ مفادات کے حوالے سے ابھی اختلافات موجود ہیں۔ ستمبر ۲۰۱۹ء میں نیویارک میں ''کواڈ'' کے وزرائے خارجہ اجلاس کے موقع پر بھی چین بڑی حد تک لاتعلق ہی رہا۔ تاہم اس اجلاس کے اختتام پر وزرائے خارجہ نے مل کر کام کرنے پر اتفاق کیا اور ''کواڈ'' کے مقاصد کا بھی اعلان کیا، جس میں سب سے اہم ''آزاد اور کھلے بحرالکاہل'' کے لیے جدوجہد تھا۔ پھر جون ۲۰۲۰ء میں بھارتی اور چینی فوج کے درمیان سرحدی پٹی پر جھڑپیں ہوئیں، جس کے نتیجے میں ۲۰ بھارتی فوجی ہلاک ہوگئے۔ اس کے بعد وہی نئی دہلی جو ''کواڈ'' اتحاد میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لیا کرتا تھا، اسے اپنی تزویراتی ترجیحات کا ازسرنو تعین کرنا پڑا اور اب اسے چین کی بڑھتی ہوئی طاقت کے سامنے اپنا توازن برقرار رکھنے کی جلدی تھی۔

اکتوبر ۲۰۲۰ء میں ''کواڈ'' ممالک کے وزرائے خارجہ کا جب ٹوکیو میں دوبارہ اجلاس ہوا تو بیجنگ نے اس اتحاد پر توجہ دینا شروع کی۔ امریکی سکریٹری خارجہ مائیک پومپیو نے بہت واضح الفاظ میں کہا کہ ہمارا مقصد تھا کہ ''کواڈ'' کو ادارے کی شکل دے کر اس کے ذریعے ایک مکمل سیکورٹی فریم ورک بنایا جائے اور وقت آنے پر اس اتحاد کو وسعت دی جائے تاکہ چینی کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے ہمیں جن چیلنجز کا سامنا ہے ان کا مقابلہ کیا جاسکے۔ (مائیک پومپیو اس سے پہلے نیوزی لینڈ، ویت نام اور جنوبی کوریا کو معاشی، ٹیکنالوجی اور سپلائی چین کے حوالے سے اکٹھا کرکے ایک اجلاس کرچکے ہیں جس کو ''کواڈ پلس'' کا نام دیا گیا تھا)۔

اس اجلاس کے بعد بھارت نے آسٹریلیا کو اپنی بحری مشقوں (مالابار) میں شرکت کی دعوت دی، جو کہ جاپان اور امریکا کے ساتھ مل کر جاری تھیں۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ بھارت نے اس سے پہلے ان مشقوں میں آسٹریلیا کو شریک کروانے سے منع کردیا تھا، کیوں کہ وہ چین کی ناراضی مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ جون میں ہونے والی سرحدی جھڑپوں نے بھارت کے لیے فیصلہ سازی میں آسانی پیدا کردی۔

تقسیم سے حملے تک:

پہلے پہل تو حکمت عملی بنانے والے چینی ماہرین کا خیال تھا کہ اس مسئلے کا سادہ سا حل ہے کہ ''گاجر اور چھڑی'' کا استعمال کیا جائے، یعنی کواڈ رکن ممالک کے معاشی اور دفاعی مفادات کے درمیان ایک لکیر کھینچ دی جائے، یعنی ان ممالک کو ان کے معاشی اور سلامتی کے مفادات پر تقسیم کردیا جائے۔ کیوں کہ ان میں سے بیشتر ممالک چین کی بڑی کنزیومر مارکیٹ سے منسلک ہیں اس لیے ان پر دباؤ ڈال کر ''کواڈ'' کو تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

اکتوبر ۲۰۲۰ء کے سالانہ اجلاس میں پھر ''مالابار'' کی بحری مشقوں کے بعد چینی وزیرخارجہ کے لہجے میں واضح تبدیلی دیکھی گئی۔ انھوں نے ''کواڈ'' پر تنقید کرتے ہوئے سے ''انڈوپیسیفک کا نیٹو'' قرار دیا اور کہا کہ کواڈ کی انڈوپیسیفک حکمت عملی ایک فاش غلطی ثابت ہوگی اور اسے خطے کے لیے سکیورٹی رسک قرار دیا۔ اس کے ساتھ ہی بیجنگ نے چھڑی کے استعمال کے لیے اپنے ہدف کا انتخاب بھی کرلیا۔ چینی روایات ہیں کہ سیکڑوں کو ڈرانے کے لیے کسی ایک کو مارو۔ اس صورت حال میں بھارت اور جاپان کو ڈرانے کے لیے اس نے آسٹریلیا کو ہدف بنانے کا فیصلہ کیا۔

بیجنگ اس سے قبل کینبرا سے تعلقات بہتر بنانے کی حکمت عملی پر عمل پیرا تھا، تاہم اچانک ہی چین نے بغیر کسی وضاحت کے آسٹریلوی کوئلے کی درآمد پر پابندی لگادی۔ اس کے بعد آسٹریلیا سے گوشت، کپاس، اون، جو، گندم، لکڑی، تانبا، چینی، لابسٹر اور شراب پر بھی پابندی لگادی گئی۔ بیجنگ کا خیال تھا کہ چار کواڈ ممالک میں سے سب سے چھوٹا ملک آسٹریلیا ہے اس لیے اس کو معاشی طور پر دباؤ میں لینا نسبتاً آسان ہوگا۔ اور وہ اپنی جغرافیائی پوزیشن کی وجہ سے چین کے لیے کسی بڑے خطرے کا باعث بھی نہیں بن سکتا۔ اسی دوران چین نے بھارت اور جاپان سے تعلقات میں بہتری لانے کا کام شروع کردیا۔ آنے والے برسوں میں چینی صدر ژی چن پنگ کے جاپان کے دورے اور جاپانی وزیراعظم سے ملاقات کی کوشش بھی کی گئی۔ اس کے علاوہ بھارت سے کشیدگی کم کرنے کی کوششیں بھی جاری رہیں اور مذاکرات کے ذریعے اپنے فوجی کی رہائی ممکن بنانے کی سر توڑ کوششیں کی گئیں تاکہ ملک میں قوم پرستوں کے غصے سے بچا جاسکے۔

تاہم بیجنگ ''کواڈ'' ممالک کے باہمی اتحاد کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکا، اس کے سارے اقدامات ''کواڈ'' اتحاد پر کوئی خاطر خواہ اثر نہ ڈال سکے۔ ٹوکیو مشرقی چینی سمندر میں بیجنگ کے جارحانہ اقدامات اور ہانگ کانگ میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر بیجنگ سے پہلے سے بھی زیادہ ناراض ہو گیا۔ اسی طرح نئی دہلی بھی سرحدی جھڑپوں کے بعد اگرچہ مذاکرات سے مسئلے کو ٹھنڈا کرنے میں تو دلچسپی ظاہر کرتا رہا تاہم بھارتی وزیرخارجہ نے واضح الفاظ میں کہا کہ ان سارے حالات کے بعد ہمیں اندازہ ہوگیا ہے کہ قومی سلامتی کے امور پر ہمیں مزید جامع حکمت عملی ترتیب دینی ہوگی اور واشنگٹن کے ساتھ اپنے تعلقات کو مزید مستحکم کرنا ہوگا تاکہ ہم چیلنجز کا مقابلہ کرسکیں۔

اس سال کے اوائل تک چین کو اندازہ ہوگیا تھا کہ ''کواڈ'' کو نظرانداز کرنے سے یا پھر اسے تقسیم کرنے کی کوشش کرنے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوسکتا تو چین نے تیسرے آپشن پر کام شروع کیا، تیسرا آپشن تھا کہ اس اتحاد پر بڑے پیمانے کا سیاسی حملہ کیا جائے۔

مارچ میں ہونے والے کواڈ سربراہ اجلاس نے چین کے بڑھتے ہوئے خدشات کو صحیح ثابت کردیا۔ صدر جوبائیڈن نے اپنے دورِ صدارت کے آغاز میں ہی کواڈ ممالک کے سربراہان کو اکٹھا کرکے (ورچوئلی) یہ اشارہ دے دیا کہ انڈوپیسیفک کے حوالے سے ان کی پالیسی میں اس اتحاد کا مرکزی کردار ہوگا۔ اتحاد کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اجلاس کے بعد مشترکہ اعلامیہ جاری کیا گیا، جس میں کہا گیا کہ ''بین الاقوامی قوانین

کے تحت ایک آزاد عالمی نظام کے فروغ کے لیے کوششیں کی جائیں گی، اور علاقائی سالمیت اور جمہوری روایات کا تحفظ کیا جائے گا۔ اعلامیہ میں یہ بھی کہا گیا کہ کواڈ ممالک کورونا کی ایک ارب خوراکوں کی مشترکہ پیداوار کریں گے اور خطے میں تقسیم کریں گے۔ مودی نے فورم سے خطاب کرتے ہوئے وہ بات کہی جس کا خدشہ چینیوں کو تھا، مودی نے کہا کہ ''کواڈ اپنے ابتدائی سالوں سے نکل آیا ہے اب یہ اتحاد خطے میں استحکام کا باعث بنے گا''۔

اس کے بعد سے تو چین کی جانب سے مذمتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ چین کا کہنا تھا کہ چند ممالک کے اس چھوٹے سے گروہ نے خطے میں ایک نئی سرد جنگ کا آغاز کر دیا ہے۔ مئی میں چینی صدر ژی نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''کثیر الجہتی'' کی اصطلاح کو استعمال کر کے چھوٹے چھوٹے گروہ تشکیل دیے جا رہے ہیں، تاکہ نظریاتی اختلافات کو ہوا دی جائے''۔ چین نے اپنے آپ کو ''کثیر الجہتی'' اور اقوام متحدہ کے قوانین پر عمل کرنے والے ملک کے طور پر جارحانہ طریقے سے پیش کرنا شروع کر دیا۔ چینی صدر اور دیگر حکام نے عالمی طاقتوں کی ذمہ داریوں اور اپنے آپ کو ذمہ دار عالمی طاقت کے طور پیش کرنے کی تکرار بڑھا دی۔ اسی طرح چین نے خطے کے دیگر فورم پر اپنی موجودگی اور فعالیت میں اضافہ کر دیا اور اس کے ساتھ ساتھ یورپ سے اپنے تجارتی معاہدوں کے لیے بھی تگ و دو تیز کر دی۔ چین کو یقین ہے کہ وہ کواڈ کو تجارتی اور سفارتی ذرائع استعمال کر کے عالمی سطح پر اسے تنہائی کا شکار کر سکتا ہے۔

چین کی کواڈ کے خلاف جارحانہ حکمت عملی کے باوجود ''کواڈ'' کی اہمیت میں مستقل اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ صدر جو بائیڈن کے جون میں یورپ کے دورے اور وہاں بھارت اور آسٹریلیا کی جی سیون اجلاس میں شرکت اور وہاں چین کے معاملے پر ہونے والی بات چیت نے ظاہر کر دیا ہے کہ کواڈ ایک بڑا ''چین مخالف'' اتحاد بننے جا رہا ہے۔ ادھر امریکا نے جنوبی کوریا کو بھی اس اتحاد میں شامل کروانے کی کوشش کی، تاہم جنوبی کوریا چین کے خلاف کسی اتحاد کا حصہ بننے سے کتراتا ہے۔ پھر بھی اس نے امریکا کے ساتھ مل کر کواڈ کی تعریف ضرور کی۔

پریشانی کی وجہ:

چین کے پاس اس طرح کی پیش رفت سے پریشان ہونے کی ٹھوس وجوہات ہیں، اسے اندازہ ہے کہ اس طرح کے اقدامات سے علاقائی اور عالمی سطح پر اس کے لیے کیا امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر دفاعی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو کواڈ کی بڑھتی ہوئی فعالیت نے چین کی آبنائے تائیوان، جنوبی بحیرۂ چین اور کچھ حد تک شمالی بحیرہ چین میں مختلف منظر ناموں سے نمٹنے کے لیے چین کی سوچ کو تبدیل کر دیا ہے۔ چین اب یہ سمجھتا ہے کہ ان علاقوں میں امریکا کے ساتھ کسی بھی تنازع کی صورت میں آسٹریلوی، بھارتی اور جاپانی فوج بھی امریکا کے پشت پر نظر آنے کا امکان بڑھ گیا ہے۔ اس کے ساتھ تائیوان کے گھیراؤ کی چینی حکمت عملی میں کواڈ ممالک اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ خاص طور پر اگر تائیوان کے دفاع کے لیے یہ ممالک اپنی سرزمین پر اسلحے کی تنصیب کی اجازت دے دیتے ہیں تو چین کے لیے خاصی مشکلات پیش آ سکتی ہیں۔ اسی طرح ایک خدشہ اس بات کا ہے کہ اگر ''کواڈ'' اور ''فائیو آئی'' ممالک کے درمیان خفیہ معلومات کے تبادلے کا کوئی معاہدہ طے پا جاتا ہے تو چین کی تزویراتی حکمت عملیاں بڑی حد تک ''ایکسپوز'' ہونے کے امکانات بڑھ جائیں گے۔

چین کے نقطہ نظر سے بدترین صورت حال یہ ہو سکتی ہے کہ ''کواڈ'' ایک بڑے چین مخالف اتحاد کی بنیاد بن جائے۔ اس اتحاد میں اگر مزید یورپی اور ایشیائی ممالک شامل ہو گئے تو بین الاقوامی عزائم کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ چین کو ڈر ہے کہ اگر یہ اتحاد اپنا رخ تبدیل کر کے معاشی، کسٹم اور دیگر اسٹینڈرڈ کی طرف جاتا ہے اور نئے قوانین متعارف کرواتا ہے تو چین کے لیے خطے میں بہت سی مشکلات کھڑی ہو جائیں گی۔

چین کے لیے مثبت پہلو یہ ہے کہ آسیان اپنے آپ کو واشنگٹن اور بیجنگ کیمپ کی کشمکش سے دور رکھے گا۔ کیوں کہ وہ پہلے بھی ایسے میں غیر جانبدار رہنے کو ہی ترجیح دیتا ہے۔ اس کے علاوہ چین کو اس بات کا بھی اندازہ ہے کہ واشنگٹن اور نئی دہلی چینی معاشی مارکیٹ کے حوالے سے تحفظ پسندانہ حکمت عملی اختیار کرتے ہیں۔ کیوں کہ دونوں ممالک جانتے ہیں کہ چین کی مارکیٹ اور اس کی کمپنیاں ان کے لیے کتنی اہمیت کی حامل ہیں۔ چین کی مستقل معاشی ترقی اور عالمی معیشت میں بڑھتا ہوا شیئر وہ تزویراتی عوامل ہیں جن کو نظر انداز کرنا دنیا کے لیے آسان نہیں ہوگا۔

چین روس کے ساتھ اپنے تزویراتی اور فوجی تعاون کو بھی دوگنا کر دے گا۔ ماسکو اور بیجنگ پہلے ہی دوطرفہ ایٹمی توانائی کے تعاون کو بڑھانے کے لیے پرعزم ہیں اور ژی کے ساتھ مئی کی ملاقات میں روسی صدر ولادی میر پیوٹن نے چین اور روس کے تعلقات کو ''تاریخی'' قرار دیا۔ چین کے نقطہ نظر سے، کواڈ کے حوالے سے روس ایک مفید فوجی شراکت دار کے طور پر کام آ سکتا ہے، وہ چین کے اسٹریٹجک آپشنز کے میدان کو جغرافیائی طور پر وسعت دینے میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر روس کی جاپان سے رقابت اور جاپان کے شمالی علاقہ جات پر اس کا مسلسل قبضہ، ٹوکیو کو چین کے خلاف کسی بھی امریکی مہم جوئی میں شرکت سے پہلے کئی مرتبہ سوچنے پر مجبور کرے گا۔

''کواڈ'' کی بڑھتی ہوئی طاقت چین کو اپنے فوجی اخراجات میں اضافہ پر مجبور کر دے گی۔ اگرچہ کچھ چینی تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ ''کواڈ'' جب تک کوئی ٹھوس شکل اختیار نہیں کر لیتا یعنی کسی خطرناک اتحاد کی صورت اختیار نہیں کر لیتا اس وقت تک ہمیں اسلحہ کی دوڑ میں شامل نہیں ہونا چاہیے۔ دوسری طرف چین کی فوجی اسٹیبلشمنٹ کا خیال ہے کہ ہمیں بدترین صورت حال کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ چینی حکام کو اس بات کا بھی ڈر ہے کہ کہیں وہ بھی سوویت یونین والی غلطی نہ دہرا دیں، جس نے اپنی معیشت سے حاصل ہونے والی آمدن کو جنگی جنون میں جھونک دیا تھا۔ تاہم اگر چین کو یہ محسوس ہوا کہ امریکی فوج اور اس کے اتحادی اپنی فوجیں مضبوط کر کے اس کے گھیراؤ کی کوشش کر رہے ہیں تو مجبوراً چین کو بھی اپنی فوج کو ''کواڈ'' جیسے خطرے سے نمٹنے کے لیے تیار رکھنا پڑے گا۔

سب سے اہم سوال یہ ہے کہ یہ ساری پیش رفت صدر ژی کے لیے کیا اہمیت رکھتی ہے؟ ایک ایسے وقت میں جب ۲۰۲۲ء میں پارٹی کی کانگریس کا اجلاس ہونے والا ہے۔ صدر ژی کو اس بات کی پوری امید ہے کہ وہ اس اجلاس سے اپنے سیاسی غلبے کے حصول کو ممکن بنا لیں گے۔ ایک ایسے وقت میں ''کواڈ'' کو ایک بڑا خطرہ بنا کر پیش کرنا اور قوم کو یہ احساس دلانا کہ چین کے دشمن سب اکٹھے ہو کر ہمارا گھیراؤ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ اتحاد کا مظاہرہ کریں۔ اور ایسے مشکل وقت میں صدر ژی کا اقتدار میں رہنا ملک کے لیے بہت ضروری ہے۔

(ترجمہ: حافظ محمد نوید نون)

"Why the QUAD alarms China".
("Foreign Affairs". August 6, 2021)

خلیجی ریاستیں افغانستان سے سبق سیکھ سکتی ہیں؟

James M. Dorsey

اس بات کا امکان ظاہر کیا جا رہا ہے کہ خلیجی ریاستیں اس پورے معاملے پر ضرور نظر رکھیں گی کہ افغانستان سے امریکی انخلا اور امریکا کی جانب سے وسط ایشیا کو چھوڑ دینے کے بعد روس اور چین سیکورٹی کے خلا اور درپیش خطرات سے کس طرح نمٹتے ہیں۔

اس عمل کے نتیجے میں ان ریاستوں کو یہ جانچنے میں مدد ملے گی کہ روس اور چین مشرق وسطیٰ میں امریکا کے کس حد تک متبادل ہو سکتے ہیں۔ اس کی ضرورت یوں پیش آئی ہے کہ مشرق وسطیٰ میں امریکا اب قابل اعتبار نہیں رہا ہے۔

امریکا کی عدم دلچسپی

ممکنہ طور پر خلیجی ریاستوں کو اب احساس ہو جائے گا کہ امریکا اب ان کے حوالے سے دلچسپی نہیں رکھتا۔ یہی چیز انہیں مجبور کرے گی کہ وہ امریکا کے حوالے سے موجود غیر یقینی کا حل تلاش کریں۔ اس کام کے لیے انہیں اپنی خود انحصاری میں اضافہ کرنا ہوگا اور خطے کے رسمی اور غیر رسمی اتحادوں خاص طور پر اسرائیل کے ساتھ تعلقات کو مضبوط کرنا ہوگا۔

اسلحے کی تجارت کا موقع

اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ روس جو کہ اسلحے کا دوسرا بڑا برآمد کنندہ ملک ہے اور چین خلیجی ممالک اور امریکا کے تعلقات میں پڑنے والی دراڑوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے خلیجی ممالک کو اسلحہ فروخت کرنے کی تاک میں ہوں گے۔ لیکن ان ممالک کے پاس امریکا کی جگہ لینے اور مشرق وسطیٰ کے تحفظ کا ضامن بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اس حقیقت نے بھی روس کو گزشتہ ماہ سعودی عرب اور مصر کے ساتھ دفاعی معاہدے کرنے سے نہیں روکا۔

ان معاہدوں کی تفصیلات تو سامنے نہیں آئیں لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ معاہدے سعودی عرب اور مصر کی جانب سے امریکا کو خبردار کرنے کے لیے کیے گئے ہیں۔ دوسری جانب روس بھی اس موقع کو استعمال کرکے امریکا کو آنکھیں دکھانا چاہتا تھا۔

موقع سے فائدہ اٹھانا آسان نہیں ہوگا

روس سے تعلق رکھنے والے ایک ماہر مشرق وسطیٰ ایلکسی خیل بنکوف کا کہنا ہے کہ 'امریکا کے ساتھ سعودی عرب کے اسٹریٹجک تعلقات کو دیکھتے ہوئے اس بات کے امکانات بہت ہیں کہ سعودی عرب عسکری طور پر روس کے ساتھ بھی ویسے ہی تعاون کرے، جس طرح امریکا کے ساتھ کرتا ہے'۔

انہوں نے مزید کہا کہ 'روس کے پاس نہ ہی اس بات کی صلاحیت ہے اور نہ ہی وہ اس بات کی خواہش رکھتا ہے کہ مصر اور سعودی عرب کے اہم اتحادی کے طور پر امریکا کی جگہ لے۔ لیکن روس اس بات کی کوشش ضرور کرے گا کہ موجودہ صورتحال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے خطے میں اپنے ہتھیاروں کی فروخت میں اضافہ کرے تاکہ پیسے کے حصول میں اضافہ ہو سکے'۔

مشرق وسطیٰ اور وسط ایشیا میں فرق ہے

عرب ریاستیں بھی یہ سمجھتی ہیں کہ مشرق وسطیٰ وسط ایشیا نہیں ہے۔ روس نے سوویت یونین کی چھتری تلے ایک طویل عرصے تک اس علاقے پر کنٹرول رکھا۔ وسط ایشیا میں موجود سیاسی ہنگامہ خیزی، ہجرت اور منشیات کے مسائل مشرق وسطیٰ کے ممالک کے بجائے چین اور روس کے لیے زیادہ پریشان کن ہیں۔ روس اور چین ان خطرات سے جس طرح نمٹیں گے وہ طرزِ عمل عرب حکمرانوں کی سوچ پر ضرور اثر انداز ہوگا۔ یہ ان دو ایشیائی طاقتوں کے لیے ایک لٹمس ٹیسٹ ہوگا اور عرب و دیگر حکمران اس پر ضرور توجہ دیں گے۔

دہشت گردی کی روک تھام

کارنیگی انڈاؤمنٹ سے منسلک ایک روسی اسکالر پال اسٹرونسکی کا کہنا ہے کہ 'روس دہشت گردی کی روک تھام کے لیے خود کو تیار کرے گا۔ اگر داعش اور اس جیسی دیگر دہشت گرد تنظیموں نے وسط ایشیائی ممالک اور خود روس پر بھی حملے شروع کردیے تو یہ روسی حکمرانوں کے لیے ایک سخت امتحان ہوگا۔ یہی وہ صورتحال ہے جس کی وجہ سے روسی پالیسی ساز پریشان ہیں'۔

روس نے تاجکستان، کرغیزستان اور روسی قیادت میں بننے والے فوجی اتحاد سی ایس ٹی او کے ممالک کے ساتھ فوجی مشقیں کرکے اس خطے کے تحفظ کے حوالے سے روس کے عزم کا اظہار کیا ہے۔

کیا روس قابل اعتبار ہے؟

پال اسٹرونسکی کا یہ بھی کہنا ہے کہ روس امریکا کی نسبت زیادہ قابل اعتبار ملک نہیں ہے۔ روس آذربائیجان کے ساتھ جنگ میں آرمینیا کی مدد کرنے سے قاصر رہا جبکہ آرمینیا سی ایس ٹی او کا رکن ہے۔ اسی روس نے ۲۰۲۰ء میں سی ایس ٹی او کے دو رکن ممالک کرغیزستان اور تاجکستان کی سرحد پر نسلی گروہوں کے درمیان جاری تصادم کو روکنے میں بھی کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ جس دوران یہ تصادم جاری تھا اس دوران روسی وزیر دفاع سرگئی شوئیگو دوشنبے میں اتحادی ممالک کے اپنے ہم منصبوں سے ملاقات کررہے تھے۔

جو بائیڈن اور امریکا کا قومی مفاد

افغانستان میں طالبان کی جیت نے مشرق وسطیٰ کے ممالک کے لیے مستقبل کے امکانات کو محدود کردیا ہے۔ دوسری جانب واشنگٹن میں بھی اب مشرق وسطیٰ میں امریکی افواج کی موجودگی پر بحث شروع ہوگئی ہے۔ صدر بائیڈن بھی اب صرف قومی مفاد پر توجہ دے رہے ہیں۔ افغانستان سے فوجی انخلا کے حوالے سے بات کرتے ہوئے بھی انہوں نے کہا کہ امریکا آگے بڑھ رہا ہے۔ انہوں بڑے پیانے پر افواج کی تعیناتی کی بھی مخالفت کی۔ اس کے برعکس انہوں نے روس اور چین سے مقابلے کے لیے معیشت اور سائبر سیکورٹی پر توجہ دینے کی بات کی۔ امریکا دہشت گردی سے نمٹنے کے لیے ایسی ٹیکنالوجی کا استعمال بھی کرے گا جس کی مدد سے مخصوص اہداف کو نشانہ بنایا جائے گا اور افغانستان جیسی جنگوں سے بچا جا سکے گا۔

مشرق وسطیٰ کے ایک انگریزی روزنامے ''دی نیشنل'' کی ایڈیٹر انچیف مینا ال اورابی نے 'امریکا اس ناٹ ایکسپشنل اینی مور' کے عنوان سے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ صدر بائیڈن کے لیے افغانستان میں امریکا کا مقصد امریکی سرزمین پر ہونے والے حملوں کو روکنا تھا۔ اس کی تمام تر توجہ انسدادِ دہشت گردی پر ہوتی تھی نہ کہ ایک قوم کی تعمیر پر اور مشرق وسطیٰ نے اس سے سبق سیکھ لیا ہے۔

لیبیا اور یمن کا حال دیکھیے

ال اورابی نے مزید لکھا کہ لیبیا اور یمن جیسے ممالک میں کہ جہاں بحران موجود ہے اور ایک قوم کی تعمیر ضروری ہے وہاں امریکا اب تک غیر متعلق رہا تھا اور اب غیر متعلق رہنا امریکا کی باضابطہ پالیسی بن گیا ہے۔

انہوں نے کہا کہ 'داعش جیسی تنظیموں اور حزب اللہ جیسی ملیشیا کے خطرات سے نمٹنے کے لیے امریکا کے اتحادی امریکا پر مزید انحصار نہیں کرسکتے۔ امریکی حکام مصر، عراق اور سعودی عرب کی جانب چین سے تعلقات بڑھانے پر سوال کررہے ہیں جبکہ انہیں یہ سمجھنا چاہیے کہ ان ممالک کے لیے چین اسی طرح ایک قابل اعتبار اتحادی ہے، جس طرح بشارالاسد کا روس ایک قابل

اعتبار اتحادی ہے۔ روس ہی بشار الاسد کی بقا کا ضامن ہے‘۔

بقا کی ضمانت

ال اورابی کی تحریر میں بقا کا لفظ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اسے امریکی انخلا کا سب سے اہم اثر گردانتی ہیں۔

وہ لکھتی ہیں کہ امریکا کی جانب سے خطے کو چھوڑ دینا اور یورپی اقوام میں اس خلا کو پُر کرنے کے حوالے سے کوئی بات نہ ہونا اس بات کا مظہر ہیں کہ مغربی لبرل جمہوریتیں اب اپنا اثر کھو چکی ہیں۔ مشرق وسطیٰ میں صورتحال کو اس نظر سے دیکھا جارہا ہے کہ دو دہائیوں تک جمہوریت کی مالا جپنے کے بعد خود امریکا نے بھی اس بیانیے سے منہ موڑ لیا ہے۔ اور ان کے لیے یہ شاید کوئی بُری چیز نہ ہو۔ ایسی غیر مؤثر حکومت جو کہ بیلیٹ کے ذریعے وجود میں آئی ہو اس سے بہتر وہ حکومت ہے جو مؤثر ہو‘۔

امریکا کو درپیش خطرہ

امریکا کو اس وقت یہ خطرہ درپیش ہے کہ اگر امریکا اور چین کے تعلقات مزید خراب ہو جائیں تو کہیں صدر بائیڈن جو کھیل کھیل رہے ہیں اس میں چین بائیڈن سے زیادہ ماہر نہ نکلے۔

مثال کے طور پر چین خطے کی صورتحال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تیل اور گیس کے خزانے رکھنے والے خلیجی ممالک کو اس بات پر قائل کرسکتا ہے کہ وہ تیل اور گیس کی قیمت امریکی ڈالر کے بجائے چینی کرنسی یوآن (رینمنبی) میں طے کریں۔ اگر چین ایسا کرنے میں کامیاب ہوگیا تو اس سے امریکا کی عالمی طاقت کو نقصان پہنچے گا۔

اویغور مسلمانوں کا مسئلہ امتحان ثابت ہوسکتا ہے!

چین کے لیے افغانستان میں مداخلت کے حوالے سے ایک امتحان یہ ہوگا کہ کیا طالبان حکومت اویغور مسلمانوں کو چین کے حوالے کرتی ہے یا نہیں۔ چین نے مصر، ملیشیا اور تھائی لینڈ جیسے ممالک سے چین کے ترک مسلم شہریوں کی حوالگی کا مطالبہ کیا ہے۔ چینی وزیرِ خارجہ وینگ جی نے جولائی میں مُلّا برادر کے ساتھ ہونے والی گفتگو میں اس حوالگی کے حوالے سے درخواست کا اشارہ دیا تھا۔

وینگ جی نے مطالبہ کیا تھا کہ طالبان تمام عسکری گروہوں کے ساتھ تعلقات ترک کردیں اور اویغور ترکستان اسلامک پارٹی (ٹی آئی پی) کے خلاف سخت کارروائی کریں۔ اب تک تو طالبان نے تمام تر دباؤ کے باوجود ان گروہوں کے خلاف کسی قسم کی کارروائی سے انکار کیا ہے جنہوں نے گزشتہ ۲۵ سالوں کی جنگ میں ان کا ساتھ دیا تھا۔

"Afghanistan: lessons for the gulf region".
("theglobalist.com". September 3, 2021)

خوراک کا ضیاع حقیقی بحران

Chad Frischmann, Mamta Mehra

روٹی، کپڑا اور مکان۔ تینوں انسان کی انتہائی بنیادی ضرورتیں ہیں یعنی ایسی اشیا جن کے بغیر زندگی کا تصور ممکن نہیں۔ ہم زندگی بھر اچھا کھانے، اچھا پہننے اور اچھی جگہ رہائش پذیر ہونے ہی کی تگ و دَو میں تو مصروف رہتے ہیں۔

آج کی دنیا بہت سے مسائل سے دوچار ہے۔ بنیادی ضرورت کی اشیا کا بحران دن بہ دن سنگین سے سنگین تر ہوتا جارہا ہے۔ خوراک اور رہائش کا مسئلہ سب سے نمایاں ہے۔ دنیا بھر میں عام آدمی خوراک کے حوالے سے خاص طور پر پریشان رہتا ہے۔ ترقی یافتہ معاشروں نے خوراک کا مسئلہ بہت حد تک حل کرلیا ہے مگر یہ بھی مفت کا معاملہ نہیں۔ ٹیکسوں کی مد میں بہت کچھ دینا پڑتا ہے تب کہیں اچھی خوراک ممکن ہو پاتی ہے۔ پس ماندہ معاشروں میں خوراک کا معاملہ زندگی اور موت کے مسئلے میں تبدیل ہو چکا ہے۔ پس ماندہ ترین ممالک کی حکومتیں عوام کو صاف، معیاری اور مقوی خوراک فراہم کرنے میں بہت حد تک ناکام ہیں۔ خوراک تو بہت دور کا معاملہ رہا، پینے کے لیے صاف پانی کی وافر مقدار میں اور آسانی سے فراہمی ممکن نہیں بنائی جاسکی ہے۔

ذرا تصور کیجیے کہ آپ بازار جاتے ہیں، وہاں سے کھانے پینے کی اشیا کے تین تھیلے بھر کر گھر واپس آتے ہیں۔ ابھی آپ گھر میں داخل بھی نہیں ہوتے ہیں کہ اشیائے خورونوش کا ایک تھیلا چوکھٹ سے باہر ہی پھینک دیتے ہیں۔ اور یہ بھرا ہوا تھیلا بعد میں کچرا کنڈی کی نذر ہو جاتا ہے۔ آپ سوچیں گے یہ صریح ضیاع ہے۔ مجموعی طور پر آج ہم یہی تو کررہے ہیں۔ عالمی سطح پر کم و بیش ۳۰ تا ۴۰ فیصد اشیائے خورونوش کھائی نہیں جاتی ہیں، پھینک دی جاتی ہیں۔ اس کا ایک واضح مطلب یہ ہے کہ دنیا بھر میں روزانہ کم و بیش ۸۰ کروڑ افراد یا تو مکمل بھوکے رہ جاتے ہیں یا اُنہیں جسم کی ضرورت کے مطابق خوراک نہیں مل پاتی اور جو مل پاتی ہے وہ بھی معیاری نہیں ہوتی۔ خوراک کا اتنے بڑے پیمانے پر ضیاع ہم میں سے بہت سوں کو شدید غصے اور بدحواسی سے دوچار کرتا ہے۔

اگر آبادی یونہی بڑھتی رہی اور معاشی ترقی کی یہی رفتار برقرار رہی تو ۲۰۵۰ء تک دنیا کو سالانہ مزید ۵ کروڑ ۳۰ لاکھ میٹرک ٹن خوراک پیدا کرنا پڑے گی۔ اس اضافی خوراک کی پیداوار یقینی بنانے کے لیے اگلے ۳۰ برس میں جنگلات اور چراگاہوں سے مزید ۴۴ کروڑ ۳۰ لاکھ ہیکٹر رقبہ کاشت کاری کے لیے وقف کرنا پڑے گا۔ یہ رقبہ بھارت کے رقبے سے بھی بڑا ہے۔ اس اضافی خوراک کی پیداوار یقینی بنانے کے عمل میں اگلے ۳۰ برس کے دوران مزید ۸۰ ارب ٹن کاربن ڈائیوکسائڈ خارج ہوگی۔ کاربن ڈائیوکسائڈ کی یہ مقدار ۲۰۱۹ء میں امریکی معیشت کی پیدا کردہ کاربن ڈائیوکسائڈ سے کم و بیش ۱۵ گنا ہے۔ دنیا بھر میں خوراک کا ضیاع اس وقت بھی ماحول کو نقصان پہنچانے والی گیسوں کا کم و بیش ۸ فیصد ہے۔

اس صورتِ حال کا تدارک کس طور ممکن ہے؟ کیا اب کوئی ایسا طریقہ نہیں بچا کہ خوراک کا ضیاع روکا جاسکے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں میں غذا اور غذائیت کی کمی پوری کی جاسکے؟ اس حوالے سے مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تحقیق اور رابطوں کی بین الاقوامی تنظیم ’’پراجیکٹ ڈرا ڈاؤن‘‘ ایک ایسا راستہ ہے جس پر چل کر موجودہ ٹیکنالوجی اور مروّج مشق کے ذریعے ماحول کو نقصان پہنچانے والی گیسوں کی سطح تسلی بخش حد تک نیچے لائی جاسکتی ہے اور ایک ایسے معاشرے اور معیشت کی راہ ہموار کی جاسکتی ہے جو توانائی اور خوراک کے قابلِ تجدید ذرائع کو فروغ دیں۔

ہم نے خوراک سے متعلق بحران اور مسائل ختم کرنے کے سلسلے میں جن ۷۶ طریق ہائے کار کا تعین کیا اُن میں جو پانچ بہترین ہیں، اُن میں سے ایک ہے ’خوراک کا ضیاع‘ روکنا۔ خوراک جس طور پیدا اور خرچ کی جاتی ہے اُس کے حوالے سے تھوڑی بہت ایڈجسٹمنٹ سے ۲۰۵۰ء تک دنیا کو زیادہ صحت بخش، غذائیت سے بھرپور خوراک فراہم کرنے، زمین کا ضیاع روکنے اور زمین کو زیادہ زرخیز بنانے میں غیر معمولی مدد ملے گی۔ ضیاع روک کر خوراک کی زیادہ فراہمی یقینی بنانے اور خوراک پیدا کرنے کے طریقے بہتر بنانے کے نتیجے میں جنگلات کی زمین کو زرعی مقاصد کے لیے وقف کرنے سے بچایا جاسکے گا۔ ساتھ ہی ساتھ توانائی، پانی، کھاد، محنت اور دیگر وسائل کا غیر ضروری استعمال بھی روکا جاسکے گا۔

کھیت سے کھانے کی میز تک کم و بیش ہر گام خوراک کا ضیاع روکنے کے مواقع موجود ہیں، جن سے استفادہ کیا جاسکتا

ہے۔ ہم فصلیں اگاتے ہیں، مویشی پالتے ہیں اور ان سب سے خوراک حاصل کرتے ہیں جو اناج، تیل اور دیگر حالتوں میں ہوتی ہے۔ یہ ساری خوراک پیکنگ کے بعد ترسیل کے مرحلے سے گزرتی ہے۔ خوراک کی ترسیل کے عمل سے بھی کئی صنعتیں جُڑی ہوئی ہیں۔ کسی ایک عمل کے رکنے سے کئی عمل رک جاتے ہیں۔ دکانوں اور مالز میں پہنچنے کے بعد پیکیجڈ خوراک ریفریجریٹرز میں رکھی جاتی ہے جو اس خوراک کی فروخت تک اِسے سڑنے سے بچانے کے لیے ماحول کو شدید نقصان سے دوچار کرنے والی گیس ہائڈروفلورو کاربنز پیدا کرتے ہیں۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ صارفین کی آنکھیں اُن کی بھوک سے زیادہ بڑی ہوتی ہیں، بالخصوص مالدار معاشروں میں۔ لوگ ضرورت سے زیادہ کھانے کے شوقین ہی نہیں عادی بھی ہیں۔ بلند انفرادی آمدن والے ممالک میں لوگ خوراک خرید کر گھر لاتے ہیں تو بڑے پیمانے پر توانائی صرف کرنے والے چولہے یا اوون آن کرتے ہیں اور ترقی پذیر معاشروں میں لوگ خام شکل کے چولھوں پر مویشیوں کے فضلے سے بنایا ہوا ایندھن جلاتے ہیں جس کے نتیجے میں بہت بڑے پیمانے پر انتہائی بدبودار اور ماحول کو نقصان پہنچانے والا دھواں خارج ہوتا ہے۔ یہ دھواں سیاہ کاربن کے سوا کچھ نہیں۔ بہت بڑے پیمانے پر کچرا پیدا کرنے والی ان سرگرمیوں کے بعد حتمی صارف کی میز تک پہنچنے والی خوراک کا متعدبہ حصہ کچرے کی ٹوکری میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہاں سے یہ ٹرکوں اور دوسری گاڑیوں کے ذریعے لینڈ فِل بھیجا جاتا ہے۔ لینڈ فِل میں یہ ضایع شدہ خوراک سڑتی، گلتی ہے اور اِس سے میتھین گیس خارج ہوتی ہے۔ یہ بھی ماحول کو نقصان سے دوچار کرنے والی گیس ہے۔ جو ٹماٹر کھیت ہی میں سڑ جاتا ہے اُس کے مقابلے میں وہ خوراک زیادہ نقصان دہ گیسیں خارج کرتی ہے جو کچرے میں پھینک دی جاتی ہے۔ ہم اس حوالے سے بہت کچھ کرتے ہیں۔

پراجیکٹ ڈرا ڈاؤن میں ہم نے فوڈ اینڈ ایگریکلچر آرگنائزیشن اور دیگر ذرائع سے حاصل ہونے والا عالمی مواد (حقائق اور اعداد و شمار) خوراک کی پیداوار اور صرف سسٹم سے متعلق ایک جامع اور مفصل ماڈل میں داخل کیا۔ اس ماڈل میں بڑھتی ہوئی آبادی کو بھی ملحوظِ خاطر رکھا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ بالخصوص ترقی پذیر ممالک میں خوراک خاص طور پر گوشت کا فی کس بڑھتا ہوا استعمال بھی پیشِ نظر رکھتے ہوئے سوچا گیا۔ اس حوالے سے کئی عشروں کے رجحانات کا جائزہ لیا گیا۔ ہم نے حساب کتاب کی بنیاد پر اندازہ لگایا کہ معیاری اور صحت بخش خوراک اور خوراک کی پیداوار کے قابلِ تجدید ذرائع اپنانے سے خوراک کا ضیاع روکنے میں معقول حد تک مدد ملتی ہے، مضر گیسیں بھی کم خارج ہوتی ہیں اور ماحول کو قابلِ رشک حد تک خوش گوار رکھا جاسکتا ہے۔

اگر دنیا کی نصف آبادی یومیہ ۲۳۰۰ کلوکیلریز کی پودوں سے حاصل ہونے والی معیاری خوراک اپنائے تو دنیا بھر میں خوراک کا ضیاع موجودہ ۴۰ فیصد کی سطح سے ۲۰ فیصد کی سطح تک لایا جاسکتا ہے۔ اس کے نتیجے میں خوراک کی اتنی بچت ہوگی کہ جن خطوں میں خوراک کی شدید قلت کے باعث لوگ خرابیٔ صحت کا شکار ہیں اُن تمام خطوں کی بھرپور مدد بھی کی جاسکے گی۔ اور اگر ہم زیادہ جوش و جذبے کا مظاہرہ کریں، پودوں سے حاصل شدہ خوراک کا استعمال بڑھانے پر زیادہ مائل ہوں تو دنیا بھر میں خوراک کا ضیاع ۱۰ فیصد کی سطح تک لایا جاسکتا ہے۔

اگر ہم خوراک کا بڑے پیمانے پر روکنے میں کامیاب ہو جائیں تو کھانے پینے کی عادات بدلنے میں بھی خاصی مدد ملے گی۔ ترقی یافتہ دنیا میں خوراک کا استعمال پہلے ہی بہت زیادہ ہے۔ ہم نے دیکھا کہ عام آدمی کو صحت کا معیار برقرار رکھنے کے لیے یومیہ ۲۳۰۰ کلوکیلریز کی خوراک درکار ہوتی ہے۔ ترقی یافتہ دنیا میں چونکہ ماحول معیاری ہے اور صحتِ عامہ کا معیار بھی بہت بلند ہے لیے اس لیے ترقی پذیر اور پس ماندہ ممالک کے لوگوں کے برعکس (جو یومیہ تین ہزار کلوکیلریز تک کی خوراک لیتے ہیں) ترقی یافتہ ممالک کے لوگ یومیہ ۲۳۰۰ کلوکیلریز تک کی خوراک لیتے ہیں۔ یوں خوراک کا کم و بیش ۲۵ فیصد ضیاع روکنے میں مدد ملتی ہے۔ ترقی پذیر اور پس ماندہ معاشروں میں صحتِ عامہ کا معیار چونکہ پست ہوتا ہے اس لیے عام آدمی کو اپنی صحت برقرار رکھنے اور بیماریوں سے لڑنے کی سکت پیدا کرتے رہنے کے لیے زیادہ کیلریز اور زیادہ لحمیات والی خوراک کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے نتیجے میں پورے سسٹم میں خوراک کا ضیاع ایک عمومی حالت کی حیثیت اختیار کرتا جاتا ہے۔ اگر دنیا بھر میں ہر شخص یہ طے کرے کہ وہ اپنی خوراک میں سبزیوں کا استعمال بڑھائے گا یا پودوں سے حاصل ہونے والی خوراک کو یومیہ صرف کا لازمی حصہ بنائے گا تو اگلے تیس برس کے دوران کم و بیش ۱۶ ارب ۲۰ کروڑ لاکھ میٹرک ٹن خوراک ضایع ہونے سے بچائی جاسکے گی۔ اس کے نتیجے میں دنیا بھر میں خوراک کی فصلوں کا گراف بلند ہوگا اور مویشی پالنے کی ضرورت گھٹے گی۔

خوراک کی پیداوار اور صرف کے طریقوں کی معیاری ایڈجسٹمنٹ (درستی) کے نتیجے میں ماحول کو بہتر بنانے میں بھی قابلِ ذکر حد تک مدد ملے گی۔ اناج، سبزیاں، مچھلی، گوشت اور ڈیری کے آئٹم ماحول کے لیے مختلف اثرات کے حامل ہیں۔ عمومی سطح پر ایک کلوگرام ٹماٹر اگانے کی صورت میں کم و بیش ۳۵۰ گرام کاربن ڈائی آکسائڈ خارج ہوتی ہے۔ دوسری طرف ایک کلوگرام گوشت (بیف) تیار کرنے پر کم و بیش ۳۶ کلوگرام کاربن ڈائی آکسائڈ کا اخراج ہوتا ہے۔ خوراک کی رسد کے پورے نظام کا جائزہ لیجیے تو اندازہ ہوگا کہ فصلوں کی شکل میں خوراک تیار کرنے کی شکل میں گرین ہاؤس یعنی ماحول کو شدید نقصان پہنچانے والی گیسوں کا اخراج مویشیوں سے حاصل ہونے والی خوراک کی تیاری کے دوران خارج ہونے والی مضر گیسوں کے مقابلے میں ۱۰ سے ۵۰ گنا کم ہوتا ہے۔ مزید برآں صنعتی زراعت نے معاملات کو مزید بگاڑا ہے۔ مونو کراپنگ عام ہے۔ زمین سے زیادہ سے زیادہ پیداوار کشید کرنے کے لیے مصنوعی کھاد کا استعمال عام ہے اور جراثیم کش دوائیں بھی بڑے پیمانے پر چھڑکنا پڑتی ہیں۔ یہ سب کچھ ماحول کو شدید نقصان پہنچا رہا ہے اور صحتِ عامہ کے حوالے سے بھی مسائل نہ صرف یہ کہ بڑھ رہے ہیں بلکہ پیچیدہ تر ہوتے جارہے ہیں۔ مصنوعی کھاد سے زمین کی زرخیزی شدید متاثر ہوتی ہے اور اس کھاد سے مضر گیسیں بھی بڑے پیمانے پر خارج ہوتی ہیں۔ بنیادی خوراک کھیت ہی میں کیڑوں مکوڑوں اور بیماریوں کے ہاتھوں ضایع ہوتی ہے اور گودام میں بھی سڑتی ہے۔ گوشت کے حصول کے لیے پالے جانے والے مویشی گھاس اور دانہ کھاتے ہیں اور ماحول کو مزید نقصان پہنچانے والی گیس خارج کرتے ہیں۔

ماحول کو نقصان سے بچانے کے لیے کیڑوں مکوڑوں کو کنٹرول کرنے کے طریقے اپنانے، مختلف فصلیں ساتھ اگانے اور فصلوں کی باری کے حوالے سے ذہانت کے استعمال کے نتیجے میں کیڑوں اور جھاڑ جھنکاڑ کا تناسب گھٹانے اور خوراک کا ضیاع کم کرنے میں خاطر خواہ حد تک مدد ملتی ہے۔ فی زمانہ مویشی پالنے کا عمل بھی نئے طریقوں سے آشنا ہو چکا ہے۔ کم وسائل خرچ کر کے زیادہ مویشی پالے جاسکتے ہیں اور ماحول کو بھی نقصان سے بچایا جاسکتا ہے۔ زمین کی زرخیزی برقرار رکھنے کے حوالے سے بہت سے طریقے اختیار کیے جارہے ہیں۔ بار بار اور زیادہ فصلیں اگانے کی تکنیک سے پیداوار میں ۵ سے ۳۵ فیصد تک اضافہ ممکن بنایا جاسکتا

ہے۔مصنوعی کھاد کے بجائے مویشیوں کے فضلے پر مشتمل کھاد استعمال کرنے سے مضر گیسوں کا اخراج کم کرنے اور زمین کو نقصان سے بچانے میں اچھی خاصی مدد ملتی ہے۔ اِسی طور کھیت سے نہ نکالی جانے والی خوراک کو کھاد کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو اسے کھیت ہی پر استعمال کرنے کے لیے بایوتوانائی میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ کھیتوں میں اس مشق کو اپنانے کی ضرورت ہے۔امریکا کے طول وعرض میں ریستوراں اس مشق کو پروان چڑھانے میں مدد کررہے ہیں۔اس حوالے سے ایک دلچسپ تنظیم ''زیرو فوڈ پرنٹ'' کام کررہی ہے جو معروف شیف انتھونی مائنٹ نے قائم کی ہے۔ یہ تنظیم گاہکوں سے چند سینٹ کا عطیہ وصول کرتی ہے تاکہ قابلِ تجدید ذرائع والے کھیتوں کو پروان چڑھانے میں مدد ملے۔

کم آمدن والے ممالک میں خوراک کا ایک بڑا حصہ بازار تک پہنچنے سے پہلے ضایع ہوجاتا ہے۔کسانوں کے لیے بہتر تعلیم اور موزوں پیشہ ورانہ تربیت یقینی بنانے کی صورت میں فصلوں کا معیار بلند کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ ایسی صورت میں جدید ترین ٹیکنالوجی سے مستفید ہونا بھی ممکن ہو جاتا ہے۔یوں خوراک کے ضیاع کا گراف بھی نیچے لایا جاسکتا ہے۔بھارت کی ریاست جھاڑکھنڈ میں کسانوں کے لیے شمسی توانائی سے کام کرنے والے ریفریجریٹرز متعارف کرائے گئے ہیں تاکہ وہ اپنی پیداوار کو سڑنے گلنے سے بچاسکیں۔ اس منصوبے کے لیے اقوامِ متحدہ کے ترقیاتی پروگرام اور گلوبل انوائرنمنٹ فیسلٹی نے فنڈنگ کی ہے۔افریقا میں دی کنسورشیم آف انٹرنیشنل ایگریکلچر ریسرچ سینٹر نے مقامی کسانوں کو بدلتے ہوئے ماحول سے ہم آہنگ فصلیں اگانے کے حوالے سے مدد دینے کا پروگرام شروع کیا ہے۔اب وہاں کسان ایسی فصلیں اگارہے ہیں جو پانی کی شدید کمی یا خشک سالی کا بھی سامنا کرسکیں۔ ساتھ ہی ساتھ زمین کا کٹاؤ روکنے کی تربیت بھی دی جارہی ہے۔

زیادہ اور اوسط آمدن والے ممالک میں خوراک کا زیادہ ضیاع بازار اور گھر میں واقع ہوتا ہے۔لوگ بیشتر معاملات میں سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔تقریباً ہر گھر میں ریفریجریٹر پایا جاتا ہے جس کے ذریعے خوراک کو خراب ہونے سے بچایا جاسکتا ہے۔ ہاں، صارفین کو یہ ضرور سوچنا چاہیے کہ وہ کیا اور کیوں خرید رہے ہیں۔ جو کچھ کھانے کے لیے خریدا جارہا ہے وہ کھانا بھی چاہیے۔سوچے سمجھے بغیر خرید کر ضایع کرنا حماقت ہے۔جلد خراب ہونے والی اشیا کو بڑی مقدار یا تعداد میں خریدنے سے گریز کیا جائے۔اگر ضرورت کے مطابق خریداری کی جائے تو خوراک کا ضیاع روکنے میں خاطر خواہ حد تک مدد ملتی ہے۔اگر زیادہ پکایا جائے تو بچا ہوا کھانا معقول طریقے سے محفوظ رکھنے پر بھی توجہ دی جانی چاہیے۔ اگر خوراک ضرورت سے زیادہ پکالی جائے تو پڑوسیوں میں بانٹنے سے تعلقات بھی بہتر ہوتے ہیں اور ضیاع کا امکان بھی برائے نام رہ جاتا ہے۔

خوراک کا ضیاع روکنے کے حوالے سے معاشرتی اور ثقافتی سطح پر بھی تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔ بہت سی سبزیاں اور پھل ایسے ہیں جو کسی خاص علاقے کے کیمنوں کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتے یا جنہیں پکانے کے دوران غیر معمولی مشقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس حوالے سے شعور اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔فرانس اور دیگر ترقی یافتہ ممالک میں لوگوں کو ایسے پھلوں اور سبزیوں کے استعمال کی طرف مائل کرنے کی بھی کوشش کی جارہی ہے جو بہت آسانی سے بڑی مقدار میں پیدا کیے جاتے ہیں۔بعض اشیائے خورونوش کو غیر جامع قرار دے کر تلف کرنے کی روایت ہے۔اس روایت کی بیخ کنی کے لیے روس، ڈنمارک اور دوسرے بہت سے ترقی یافتہ ممالک کے سپر اسٹورز میں ایسے شیلف الگ ہوتے ہیں جن میں غیر جامع قرار دی گئی اشیائے خورونوش رکھی جاتی ہیں۔مقصود یہ ہے کہ لوگ انہیں ضایع نہ کریں بلکہ کسی نہ کسی طرح انہیں اپنی خوراک کا حصہ بنائیں تاکہ نوبت اُن کے ضیاع تک نہ پہنچے۔ترقی یافتہ ممالک میں لوگ بالعموم ایک دن پرانی ڈبل روٹی نہیں کھاتے جو کچرا کنڈی کی نذر کی جاتی رہی ہے۔ اب یہ رجحان پروان چڑھ رہا ہے کہ ایک دن کی باسی ڈبل روٹی کو کچرا کنڈی میں پھینکنے کے بجائے کھانے کی تحریک دی جائے۔ ضرورت مند افراد ایسی ڈبل روٹی مفت لے سکتے ہیں۔

خوراک کا ضیاع روکنے میں تھوک اور پرچون فروش مل کر کلیدی کردار ادا کرسکتے ہیں۔ بالکل تازہ چیزیں کھانا اچھی بات ہے مگر ایک یا دو دن پرانی اشیائے خورونوش کو پھینک دینا غیر منطقی ہے۔کوئی بھی چیز ایک یا دو دن میں سڑ، گل نہیں جاتی۔خوراک کا ایسا ضیاع روکنے کی ضرورت ہے، بالخصوص پس ماندہ معاشروں میں۔ریستوراں میں بچا ہوا کھانا گھر لے جانے کی تحریک بھی دی جاسکتی ہے۔ اس حوالے سے حکومتوں اور بڑی کمپنیوں کا کردار بھی بہت اہم ہے۔امریکا میں سرکاری کیفے ٹیریا کم و بیش بیس لاکھ افراد کے لیے کھانا تیار کرتے ہیں۔سبزیوں اور پودوں سے حاصل ہونے والی دیگر اشیائے خورونوش کو ترجیح دے کر خوراک کا ضیاع روکنے میں معقول حد تک مدد لی جاسکتی ہے۔

ہم چاہے جتنی کوشش کرلیں، خوراک ایک خاص حد تک تو ضایع ہوگی ہی۔ ہاں، ہماری احتیاط پسندی خوراک کا غیر معمولی یا بڑے پیمانے پر ضیاع روکنے میں معاون ثابت ہوسکتی ہے۔لوگوں کو کھانے پینے کی عادات بدلنے پر بھی توجہ دینی چاہیے۔ جو چیز کھائی جاسکتی ہے وہ کچرے میں نہیں پھینکی جانی چاہیے۔ اس حوالے سے قوانین بھی نافذ کیے جاسکتے ہیں۔سب سے بڑھ کر اہم بات یہ ہے کہ لوگوں کی تربیت کی جائے۔اشیائے خورونوش کا تیسرا تھیلا ضایع ہونے سے بچانا ہم سب کی ترجیح ہونا چاہیے۔ (ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"Massively reducing food waste could feed the world". ("Scientific American". Oct. 2021)

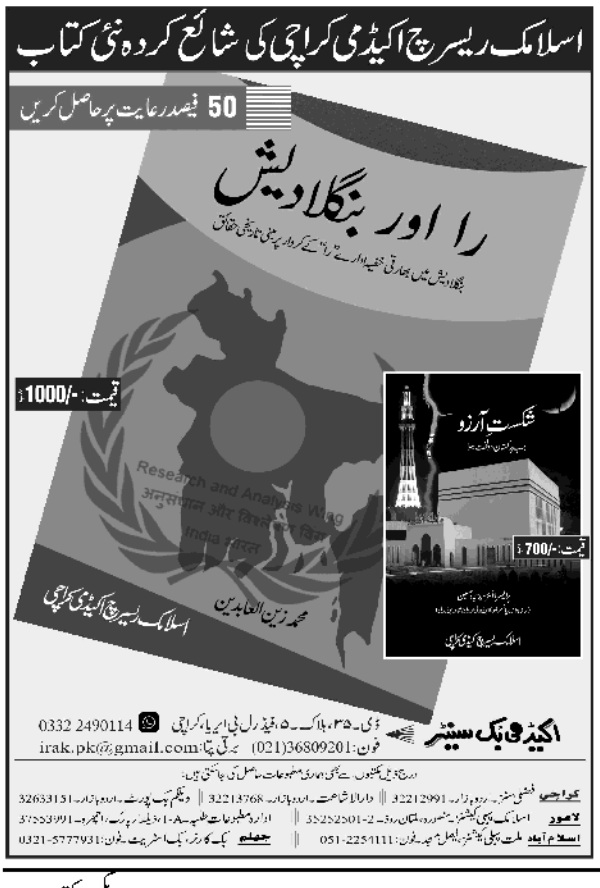

سی آئی اے کا نیا بحران

Julian E. Barnes - Adam Goldman

امریکی خفیہ ادارے سی آئی اے کو شدید اندرونی بحران کا سامنا ہے۔ بحران یہ ہے کہ سی آئی اے کے لیے رول پر جاسوسی اور مخبری کرنے والے غیر ملکیوں کو بہت سے خطرات لاحق ہیں۔ وہ گرفتار بھی ہو رہے ہیں اور بہت سوں کو موت کے گھاٹ بھی اتارا گیا ہے۔ ایسے معاملات بھی سامنے آئے ہیں کہ سی آئی اے اپنے غیر ملکی مخبروں کو بچانے میں نہ صرف ناکام رہا بلکہ اُس نے حالات کے دباؤ کے تحت اُن کی گرفتاری یا ہلاکت پر سمجھوتا بھی کیا۔ یہ سب کچھ سی آئی اے کی ساکھ کو شدید نقصان پہنچانے کا باعث بن رہا ہے۔ بائیڈن انتظامیہ کو بھی اس حوالے سے سُبکی کا سامنا ہے۔ افغانستان کی بدلی ہوئی صورتِ حال سے سی آئی اے اور بائیڈن انتظامیہ کی ساکھ کو مزید دھچکا لگا ہے کیونکہ دنیا بھر میں یہ تاثر ابھرا ہے کہ امریکا اب سپر پاور کی حیثیت سے اپنی برتری برقرار رکھنے میں نہ صرف یہ کہ ناکام ہو چکا ہے بلکہ اپنی اصلاح کے لیے ذریعے بہتری کی راہ ہموار کرنے کی تحریک سے بھی محروم ہو چلا ہے۔ اِس مضمون میں سی آئی اے کی اندرونی کمزوری کو موزوں طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔

امریکا کے کاؤنٹر انٹیلی جنس حکام نے ایک خفیہ پیغام کے ذریعے دنیا بھر کے اسٹیشنز اور اڈوں کو بتایا ہے کہ امریکی خفیہ ادارہ (سی آئی اے) دیگر ممالک کے بہت سے جن لوگوں کی خدمات جاسوسی کے لیے حاصل کرتا ہے ان میں سے اکثریت سے محروم ہوتا پڑ رہا ہے۔

ایک غیر معمولی انتہائی خفیہ کیبل کے ذریعے دیے جانے والے پیغام میں بتایا گیا ہے کہ سی آئی اے کا انسدادِ جاسوسی مشن کئی برسوں کے دوران غیر ملکی مخبروں کے کیسز کا جائزہ لے رہا ہے جو مارے گئے، قتل کر دیے گئے یا جن کے معاملے میں اصولوں پر سودے بازی کر لی گئی۔ اس کیبل میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ سی آئی اے کے بہت سے مخبروں کو حریف خفیہ اداروں نے سزائے موت بھی دے دی۔ اس نوعیت کے کیبلز میں بالعموم ایسی تفصیلات کا تبادلہ نہیں کیا جاتا۔

اس کیبل سے امریکی خفیہ ادارے کی ان مشکلات پر روشنی پڑتی ہے، جو اسے دنیا بھر میں مشکل ماحول میں کام کرنے کے حوالے سے درپیش ہوتی ہیں۔ حالیہ چند برسوں کے دوران روس، چین، ایران اور پاکستان جیسے حریف ممالک کے خفیہ ادارے سی آئی اے کے ذرائع کی تلاش میں رہے ہیں اور بعض کیسز میں انہوں نے سی آئی اے کے ایجنٹس یا مخبروں کو ڈبل ایجنٹ بھی بنا ڈالا ہے۔

کیبل میں یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ جاسوسوں اور مخبروں کا تقرر ایک ایسا معاملہ ہے جس میں خطرات بھی مول لینا پڑتے ہیں۔ ساتھ ہی حالیہ چند برسوں کے دوران سی آئی اے کو لاحق مشکلات کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور یہ بھی کہ ایجنٹوں کا تقرر کرتے وقت تیزی دکھائی جاتی ہے، تاہم کاؤنٹر انٹیلی جنس کے حوالے سے جن خطرات کا سامنا ہو سکتا ہے ان پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی جاتی۔ اس مسئلے کو مذکورہ کیبل میں ''سلامتی سے پہلے مشن'' کا نام دیا گیا ہے۔

چند برسوں کے دوران بہت بڑی تعداد میں مخبروں پر سمجھوتا کرنے کے اعتراف سے بایومیٹرک اسکین، چہرے کی شناخت، مصنوعی ذہانت کے استعمال اور مخبروں تک پہنچنے کے لیے سی آئی اے افسران کی نقل و حرکت کا سراغ لگانے کے لیے آلات کی ہیکنگ جیسے معاملات میں دیگر ممالک کی مہارت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

سی آئی اے کے پاس ان خفیہ معلومات کو جمع کرنے کے کئی راستے اور ذرائع ہیں، جن کا تجزیہ کر کے ماہرین پالیسی سازوں کے لیے بریفنگ کی تیاری کرتے ہیں، تاہم دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ایجنٹوں کی فراہم کردہ معلومات اس حوالے سے کی جانے والی کاوشوں میں کلیدی کردار کی حامل ہیں۔ اس نوعیت کی معلومات جمع کرنے کے حوالے سے سی آئی اے غیر معمولی ساکھ کی حامل رہی ہے۔

سی آئی اے کے سابق افسران کا کہنا ہے کہ سی آئی اے کے کیس افسران مخبروں کی خدمات حاصل کر کے اپنے لیے ترقی اور انعامات کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ کیس افسران کو بالعموم کاؤنٹر انٹیلی جنس آپریشنز کے حوالے سے ترقی نہیں دی جاتی، مثلاً یہ معلوم کرنا کہ کوئی مخبر کسی اور ملک کے لیے تو کام نہیں کر رہا۔

سی آئی اے نے دو عشروں کے دوران افغانستان، عراق اور شام جیسے ممالک میں دہشت گردوں کی طرف سے لاحق خطرات سے نمٹنے پر زیادہ توجہ دی ہے تاہم اب بھی چھوٹی یا بڑی دشمن ریاستوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات کا حصول اس کا مرکزی ایجنڈا ہے۔ مثلاً آج کل پالیسی ساز چین اور روس کے بارے میں زیادہ خفیہ معلومات کے حصول کے خواہش مند ہیں۔ سابق افسران نے بتایا کہ مخبروں کو کھو بیٹھنا کوئی نیا مسئلہ نہیں۔ کیبل سے البتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر جتنا سمجھا جاتا ہے یہ معاملہ اس سے کہیں زیادہ سنگین ہے۔

جن لوگوں نے یہ کیبل پڑھا ہے ان کا کہنا ہے کہ اصلاً تو یہ ان فرنٹ لائن افسران کے لیے انتباہ ہے، جو جاسوسوں اور مخبروں کا تقرر کرنے اور انہیں کام پر لگانے کے عمل میں براہِ راست شریک رہتے ہیں۔ اس کیبل نے سی آئی اے کے کیس افسران کو بتایا ہے کہ ساری توجہ صرف مخبروں یا ذرائع کے تقرر پر مرکوز نہیں رکھنی بلکہ انہیں حریف خفیہ اداروں کے دام میں پھنسنے سے بچانے کو بھی مقدم رکھنا ہے۔ اس کیبل کے ذریعے سی آئی اے کے کیس افسران کو یاد دلایا گیا ہے کہ انہیں ایسے تمام اقدامات کے بارے میں سوچنا ہے جن کے ذریعے وہ سی آئی اے کے مخبروں کو محفوظ رکھتے ہوئے ان سے بہتر طور پر کام لے سکتے ہیں۔ سابق سی آئی اے افسران کا کہنا ہے کہ سی آئی اے کے لیے مخبر یا ایجنٹس کا تقرر کرتے وقت سینئر لیڈرز اور فرنٹ لائن اسٹاف کو سب سے زیادہ توجہ مخبروں کی سلامتی اور کاؤنٹر انٹیلی جنس پر دینا ہے۔ سی آئی اے کے ایک سابق آپریٹو ڈگلس لندن کہتے ہیں کہ جب کسی ایجنٹ کے ساتھ کچھ غلط ہو جاتا ہے تب کوئی بھی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ کبھی کبھی حالات پر ہمارا کچھ اختیار نہیں ہوتا مگر بہت سے معاملات میں تساہل اور غفلت کے نتیجے میں بھی کسی ایجنٹ کے لیے حالات بہت برے ہو جاتے ہیں مگر تب اعلیٰ عہدیداروں میں سے کسی کو بھی موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاتا۔

ڈگلس لندن نے کیبل نہیں پڑھا تاہم ان کی کتاب ''دی ریکروٹر: اسپائنگ اینڈ دی لوسٹ آرٹ آف امریکن انٹیلی جنس'' میں اس نکتے پر بحث کی ہے کہ خفیہ آپریشن اور نیم فوجی نوعیت کی کارروائیوں کی طرف سی آئی اے کے جھکاؤ سے روایتی جاسوسی متاثر ہوئی ہے، جس میں کام کا زیادہ مدار ایجنٹوں کے تقرر اور ان سے ڈھنگ سے کام لینے پر ہوتا ہے۔

سابق سی آئی اے افسران کا کہنا ہے کہ مشکلات و مسائل اور کاؤنٹر انٹیلی جنس آپریشن سے متعلق پیچیدگیوں کے بارے میں دنیا بھر میں سی آئی اے کے اسٹیشنز اور اڈوں کو بھیجے جانے والے پیغامات نئے نہیں۔ اس طرح کی باتیں تو ہوتی رہتی

ہیں۔اور یہ کہ کاؤنٹر انٹیلی جنس افسران اس طرح کی تفصیلات سی آئی اے کی وسیع ورک فورس سے بھی چھپاتے ہیں۔جب اس میمو کے بارے میں سوال کیا گیا تو سی آئی اے کی ترجمان نے کوئی تبصرہ کرنے سے گریز کیا۔

گزشتہ برس سی آئی اے میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر فار کاؤنٹر انٹیلی جنس کے منصب پر ترقی پانے والی شیتل پٹیل مشن سینٹر کی سربراہ ہیں۔انہوں نے سی آئی اے کے موجودہ اور سابق افسران کو مختلف معاملات میں اشتباہ کرنے کے حوالے سے کسی بھی مرحلے پر ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔

جنوری میں شیتل پٹیل نے سی آئی اے کے ریٹائرڈ افسران کو ایک خط بھیجا، جس میں انہیں خبردار کیا کہ وہ خفیہ نیٹ ورک قائم کرنے کی کوششوں کے حوالے سے دوسری حکومتوں کو اپنی خدمات فراہم نہ کریں۔بعد میں منظر عام پر آجانے والے اس خط میں سی آئی اے کے سابق افسران سے کہا گیا ہے کہ وہ صحافیوں سے گفتگو سے بھی گریز کریں۔

سی آئی اے کے سابق افسران کا یہ بھی کہنا ہے کہ سی آئی اے کے افسران کو کاؤنٹر انٹیلی جنس کے حوالے سے سنجیدہ ہونے پر مائل کرنے کا ایک اچھا طریقہ یہ بھی ہے کہ معاملات کو پھیلا دیا جائے۔گزشتہ ہفتے بھیجے جانے والے میمو میں کہا گیا ہے کہ سی آئی اے اپنے حریفوں کو کم آنک رہی ہے یعنی یہ خیال پختہ ہو چکا ہے کہ سی آئی اے کے افسران اور ان کی مہارت حریف خفیہ ایجنسیوں کے عملے اور مہارت سے بڑھ کر ہے۔حقائق کا جائزہ لینے سے معلوم ہوا ہے کہ جن ممالک کو امریکا نشانے پر لیتا ہے، وہ بھی سی آئی اے کے مخبروں کا سراغ لگانے کے فن میں طاق ہیں۔چند سابق سی آئی اے افسران کا کہنا ہے کہ عشروں تک دہشت گردی کے خطرات سے نمٹنے پر متوجہ رہنے اور خفیہ رابطوں پر زیادہ انحصار کرنے سے مخالف یا حریف خفیہ اداروں سے نمٹنے کی صلاحیت کمزور پڑ چکی ہے۔بیرونی حکومتوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ خفیہ معلومات حاصل کرنے کے لیے مخبروں کی بھرتی، تربیت اور ان سے کام لینا دہشت گرد نیٹ ورکس میں ذرائع کو پروان چڑھانے سے بہت مختلف کام ہے۔

میمو میں بتایا گیا ہے کہ بہت سے مخبر گرفتار کرلیے گئے یا مار دیے گئے، تاہم بہت سے مخبر امریکا کے خلاف کام کرنے پر بھی مائل ہوگئے۔ان کی تعداد معلوم نہیں ہوسکی ہے۔کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حریف خفیہ ادارے سی آئی اے کے کسی ایجنٹ کا سراغ لگا لیتے ہیں تو اسے گرفتار کرنے کے بجائے ڈبل ایجنٹ بنا کر امریکا کے خلاف استعمال کرنے لگتے ہیں۔یہ ڈبل ایجنٹ سی آئی اے کو لاحاصل قسم کی معلومات فراہم کرتے ہیں یا پھر گمراہ کرتے ہیں۔اس سے سی آئی اے کے خفیہ معلومات جمع کرنے اور ان کا تجزیہ کرنے کے عمل پر شدید منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔سابق سی آئی اے افسران نے بتایا کہ پاکستانی اس کھیل کے بڑے کھلاڑی ہیں۔

افغانستان میں امریکا کی حمایت یافتہ حکومت کے خاتمے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ طالبان اور خطے کی انتہا پسند تنظیموں سے پاکستان کے روابط کے بارے میں زیادہ جاننا اب بہت اہم ہے۔اب ایک بار پھر سی آئی اے پر پاکستان میں مخبروں کا نیٹ ورک تیار کرنے کے حوالے سے غیر معمولی دباؤ ہے۔یہ حقیقت بھی تسلیم کیے ہی بنتی ہے کہ اس نوعیت کے نیٹ ورکس کا سراغ لگا کر انہیں توڑنے میں پاکستان کو ملکہ حاصل ہے۔

امریکا میں کئی صدور کی حکومتوں نے چین اور روس سے مسابقت کے پیش نظر جاسوسی کے مضبوط نیٹ ورکس قائم کرنے اور برقرار رکھنے کی ضرورت محسوس کی ہے۔جاسوسی اور مخبری کے نیٹ ورکس کا تحفظ یقینی بنانا بھی غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔

سابق سی آئی اے افسران کا کہنا ہے کہ روس اور چین میں ٹیکنالوجی بھی ایک مسئلہ بن چکی ہے۔مصنوعی ذہانت، بایومیٹرک اسکینر، چہرے کی شناخت اور دیگر ٹیکنالوجیز نے ان ممالک کی حکومتوں کے لیے اپنے ہاں کام کرنے والے سی آئی اے افسران کا سراغ لگانا قدرے آسان کردیا ہے۔ایسے میں مخبروں اور ایجنٹس سے ملاقاتیں اور رابطے انتہائی دشوار ہو چکے ہیں۔

سی آئی اے کے خفیہ اندرونی نظام covcom میں نقب لگائے جانے سے چین اور ایران کو اس کے نیٹ ورکس کا سراغ لگانے میں مدد ملی ہے۔دونوں معاملات میں سی آئی اے کے مخبروں کو سزائے موت دے دی گئی۔دوسروں کو سی آئی اے نے کسی نہ کسی طور نکال کر دوبارہ بسا دیا۔

ایران اور چین میں سی آئی اے کے بعض افسران کا یہ خیال ہے کہ مخالف خفیہ ایجنسیوں کو چند اپنوں ہی نے معلومات فراہم کیں جن کی بنیاد پر مخبر بے نقاب ہوئے۔امریکی فضائیہ کی سابق سارجنٹ مونیکا ایلفرائیڈ وِٹ منحرف ہوکر ایران کے لیے کام کرنے لگی تھی۔۲۰۱۹ء میں اس پر ایران کو خفیہ معلومات فراہم کرنے کی فرد جرم عائد کی گئی۔ایرانیوں نے پہلے یہ اندازہ لگایا کہ اس پر بھروسا کیا جاسکتا ہے۔اس کے بعد ہی اس کی معلومات کو قابل قبول سمجھا گیا۔اسی سال سی آئی اے کے سابق افسر اجیری چن شنک لی کو چینی حکومت سے متعلق خفیہ معلومات دشمن کو فراہم کرنے کے الزام میں ۱۹ سال قید کی سزا سنائی گئی۔سابق سی آئی اے افسران کہتے ہیں کہ ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ سی آئی اے نے اپنے مشن پر اس قدر توجہ دی کہ مخبروں یا ذرائع کے تحفظ کے حوالے سے غفلت کا مظاہرہ کیا گیا۔ایسے میں بعض مخبروں کو شدید نقصان دہ حالات کا بھی سامنا کرنا پڑا۔۲۰۰۹ء میں افغانستان کے شہر خوست میں سی آئی اے کے ایک اڈے پر بم حملہ مشن کو سلامتی پر ترجیح دینے کی خاصی واضح مثال ہے۔اس واقعے میں اردن کا ایک ڈاکٹر ملوث تھا۔سی آئی اے والے سمجھ رہے تھے کہ وہ القاعدہ میں نقب لگانے کے حوالے سے معاونت کرے گا مگر اس کے بجائے وہ امریکا کے خلاف گیا۔ڈگلس لنڈن کا کہنا ہے کہ ہماری خواہش تھی کہ بہت تیزی سے بہت بڑی کامیابی حاصل کرلی جائے۔اس آپا دھاپی میں جاسوسی کے فن کی مبادیات کو نظر انداز کردیا گیا۔ڈگلس لنڈن کہتے ہیں کہ اب پھر یہ یاد دہانی کرانے کا وقت آگیا ہے کہ کسی بھی مشن کے حوالے سے جاسوسی کی مبادیات اور سلامتی میں سے کسی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔وہ مزید کہتے ہیں کہ اپنا کام کیجیے اور تساہل کا مظاہرہ مت کیجیے۔یہ دراصل اس بات کو بیان کرنے کا ایک طریقہ ہے کہ ہم اتنے جامع نہیں جتنے تصور کیے جاتے ہیں۔یہ بہر کیف مثبت چیز ہے۔(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"Captured, killed or compromised: CIA admits losing dozens of informants". ("nytimes.com". Oct. 6, 2021)

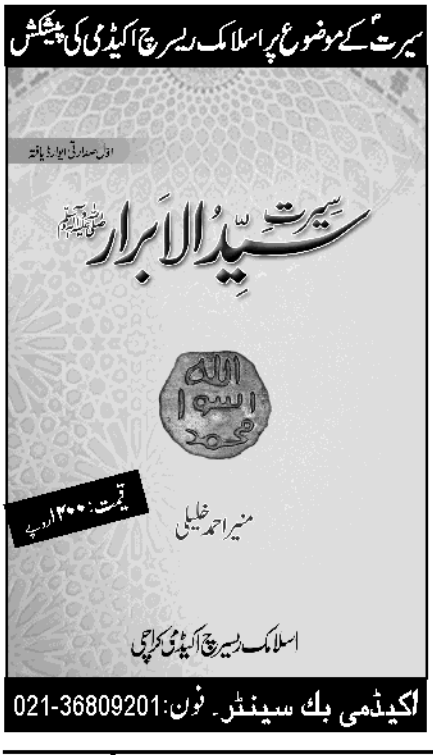

نیا افغانستان: بھارت کے لیے شدید دھچکا

افغانستان پر طالبان کے تصرف نے بھارت کے لیے سیاست، معیشت اور سیکورٹی کے حوالے سے غیر معمولی چیلنج کھڑا کر دیا ہے۔ اب بھارتی قیادت کی کوشش ہوگی کہ طالبان سے خوشگوار تعلقات استوار کرنے کی کوشش کی جائے اور دوسری طرف ایران اور روس سے بھی بنا کر رکھی جائے تاکہ خطے میں دہشت گردی کا خطرہ ٹالا جاسکے۔ چین اور پاکستان کے درمیان واقع ہونے کی بدولت بھارت کے لیے سیکورٹی کے حوالے سے افغانستان کی اہمیت غیر معمولی نوعیت کی ہے۔ افغانستان سے بھارت کے تعلقات اچھے رہے ہیں اور ان تعلقات کی بدولت ہی بھارت خطے میں سیاست، معیشت اور سلامتی کے حوالے سے قومی اہداف کے حصول میں کامیاب رہا ہے۔ اشرف غنی اور اُس سے قبل حامد کرزئی کی حکومت سے بھارت کے بہتر تعلقات نے پاکستان کو ایک خاص حد تک رکھنے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ دو عشروں کے دوران بھارت نے افغانستان میں غیر معمولی سرمایہ کاری کی ہے اور عوامی سطح پر رابطے بڑھانے میں بھی دلچسپی لی ہے۔ بھارت کے لیے افغانستان نے مشرقِ وسطیٰ اور وسطِ ایشیا سے تجارت بڑھانے میں بھی کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ مگر اب جبکہ افغانستان میں اقتدار طالبان کے ہاتھ میں ہے، بھارت کی وہ نرم قوت خطرے میں پڑ گئی ہے جو اُس نے دو عشروں کی محنت سے پروان چڑھائی تھی۔

افغانستان کم و بیش ساڑھے چار ہزار میل سے بھی زائد طوالت کی اُس راہداری کا اہم حصہ ہے جس کے ذریعے بھارت، روس، ایران، افغانستان اور آذربائیجان کے درمیان تجارت ہوتی رہی ہے۔ اس راہداری کو حقیقی معنوں میں کارآمد بنانے میں افغانستان کا کردار سب سے بڑھ کر ہے۔ اُس کا استحکام ہی اس راہداری کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ بھارت اور وسطِ ایشیا کے درمیان تجارت آسان بنانے کے حوالے سے بھی افغانستان راہداری کے طور پر بہت اہم ہے۔

بھارت نے دو عشروں کے دوران افغانستان میں امریکا کی قائم کردہ حکومت کے تحت بنیادی ڈھانچے کو مضبوط بنانے اور تجارتی ماحول کو زیادہ جاندار بنانے کی خاطر کم و بیش تین ارب ڈالر خرچ کیے ہیں۔ بھارت نے ملک بھر میں سڑکوں، پُلوں، ڈیمز، اسکول اور اسپتالوں کی تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ ہزاروں افغان طلبہ کو تعلیمی وظائف فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ بھارت نے افغانستان کے سول سروینٹس کی تربیت میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔

۲۰۱۱ء میں بھارت نے اس وقت کی افغان حکومت سے ایک اسٹریٹجک معاہدہ کیا، جس کے نتیجے میں افغان سرزمین پر بھارت کا معاشی کردار ہی نہیں بڑھا بلکہ سفارتی تعلقات کو نئی بلندی تک لے جانے میں بھی مدد ملی۔

بھارت نے افغانستان میں ضلع دلآرام سے ایرانی سرحد تک ۱۳۵ میل لمبی شاہراہ کی تعمیر میں بھی سب سے زیادہ حصہ ڈالا ہے۔ ۱۵ کروڑ ڈالر کی لاگت سے تعمیر کی جانے والی زرنج دلآرام شاہراہ اسٹریٹجک نقطۂ نظر سے بھی بہت اہم ہے کیونکہ یہ پاکستان کو بائی پاس کرتے ہوئے ایرانی بندرگاہ چابہار سے افغانستان تک براہِ راست رسائی دیتی ہے۔

طالبان کی فتح اور ایوانِ اقتدار میں اُن کی آمد سے افغانستان میں اسٹریٹجک حوالے سے بھارت کے لیے مشکلات پیدا ہوئی ہیں۔ حالیہ موسمِ گرما کے دوران طالبان کی تیز رفتار فتوحات سے جتنی حیرت باقی دنیا کو ہوئی اُتنی ہی حیرت بھارت کو بھی ہوئی۔ روس اور چین تو کسی نہ کسی سطح پر طالبان سے رابطے میں رہے ہیں مگر بھارت نے امریکا کی وساطت سے قائم ہونے والی افغانستان کی کمزور جمہوری حکومت کی حمایت جاری رکھی اور اس دوران طالبان سے اُن کا رابطہ برائے نام بھی نہیں رہا۔ حال ہی میں برطرف ہونے والی اشرف غنی حکومت کی غیر معمولی حمایت کرنے اور پاکستان سے مخاصمت کے باعث طالبان بھی بھارت پر بھروسا کرنے کو تیار نہیں۔ ایسی حالت میں بھارت اور طالبان دونوں کے لیے مستقبلِ قریب میں اشتراکِ عمل بہت مشکل دکھائی دیتا ہے۔

اگست ۲۰۲۱ء کے وسط میں طالبان نے بہت یقین دہانیاں کرائیں، مگر پھر بھی بھارت نے کوئی خطرہ مول لینا مناسب نہ سمجھا اور افغانستان سے اپنے شہریوں کو بحفاظت نکالنے کو ترجیح دی۔ ۱۸ ستمبر کو تاجکستان کے دارالحکومت دوشنبے میں منعقدہ شنگھائی تعاون تنظیم کے سربراہ اجلاس میں بھارت کے وزیرِ اعظم نریندر مودی نے معاشرے کے تمام طبقات پر مشتمل حکومت نہ بنانے پر طالبان کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔

پاکستان اور بھارت روایتی حریف ہیں۔ مستقبلِ قریب میں پاکستان چاہے گا کہ افغانستان میں بھارت کے اثرات زیادہ سے زیادہ کم کرنے کے لیے طالبان سے مل کر کام کرے۔ چند برسوں کے دوران افغانستان سے تعلقات بہتر بنانے کی بھارتی کوششوں سے پاکستان میں گھیرے جانے کا تاثر پیدا ہوا ہے۔ پاکستانی قیادت سمجھتی ہے کہ مشرق میں بھارت خود ہے اور اب وہ شمال اور مغرب کی سمت سے بھی پاکستان کو گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہا ہے۔ پاکستان مختلف مراحل میں طالبان کی غیر معمولی مدد کرتا رہا ہے، جس کے نتیجے میں افغان حکومت سے اُس کے تعلقات زیادہ خوشگوار نہیں رہے۔ طالبان کی آمد سے ایک ایسی حکومت کے قیام کی راہ ہموار ہوئی ہے، جو پاکستان کے مفادات کو تحفظ فراہم کرنے والا ماحول فراہم کرتی ہو اور پاکستان بھی موافق حالات سے استفادہ کرنا چاہے گا۔ ایسے میں یہ بھی بعید از امکان نہیں کہ اپنی پوزیشن مضبوط رکھنے کے لیے پاکستانی قیادت طالبان کو بھارت سے بہتر اور خوشگوار تعلقات استوار کرنے سے روکے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ چین سمیت افغانستان کے تمام پڑوسیوں سے بہتر تعلقات اور وسیع تر اشتراکِ عمل کی راہ ہموار کرنے کی بھی کوشش کرے گا۔ بھارت سے کسی بھی سرحدی مناقشے کی صورت میں اب پاکستان اپنے اہم اسٹریٹجک اثاثے تیزی سے منتقل کرنے کی پوزیشن میں بھی ہوگا اور ایسی حالت میں کسی بھی خطۂ جدل تک بھارت کی رسائی دشوار ہوگی۔

ماضی کی چند ناخوشگوار یادوں کے باعث نئی دہلی کے لیے طالبان پر زیادہ بھروسا کرنا ممکن نہ ہوگا۔ طالبان ہی کے دور میں بھارت کے ایک مسافر بردار طیارے کو اغوا کر کے افغانستان لے جایا گیا تھا اور پھر اس طیارے کے مسافروں کی رہائی کے عوض پاکستان نے چند ہائی پروفائل شخصیات کو بھارت کی جیل سے نکلوایا تھا۔ بھارت اور چین کے درمیان پائے جانے والے چند اسٹریٹجک تنازعات کے پیشِ نظر چین اور افغانستان کے درمیان بڑھتا ہوا اشتراکِ عمل بھی بھارت کے لیے ایک بڑا دردِ سر ہوگا۔ چین اور افغانستان کے درمیان رابطے بڑھ رہے ہیں۔ افغانستان میں عبوری حکومت کے قیام سے امن و استحکام کی حالت پیدا ہوگی اور پاکستان کی مدد سے چینی قیادت افغانستان کے لیے انسانی ہمدردی کی بنیاد پر امداد اور اسٹریٹجک تعلقات کا دائرہ وسیع کرنے پر زیادہ توجہ دے گی۔ ساتھ ہی ساتھ چینی قیادت چاہے گی کہ افغانستان میں ترقیاتی کاموں کے لیے بھی اپنا کردار بڑھائے۔ طالبان کی پیش قدمی اور کابل پر تصرف کے دوران بھی پاکستان، چین اور روس نے کابل میں سفارت

خانے کھلے رکھے تھے۔ اب چین چاہے گا کہ افغانستان میں اپنے قدم مضبوطی سے جمائے رکھنے کے لیے اِس بُرے وقت میں اُس کی زیادہ سے زیادہ مدد کرے۔ کابل میں عبوری حکومت کے قائم ہوتے ہی چین نے افغانستان کے لیے ۳ کروڑ ۱۰ لاکھ ڈالر کی فوری امداد کا اعلان کیا۔

طالبان واضح طور پر کہہ چکے ہیں کہ چین اُن کے لیے ایک اہم ہمسایہ ہے اور افغانستان چاہے گا کہ اُسے بھی چین کے بیلٹ اینڈ روڈ انشیٹیو کا حصہ بنایا جائے۔

افغانستان پر طالبان کا تصرف قائم ہو جانے سے بھارت کے لیے سرحد پار سے دہشت گردی کا خطرہ بڑھ گیا ہے۔ طالبان کی پیش قدمی کے دوران افغانستان کی جیلوں سے رہائی پانے والوں کو افغانستان اور اُس کے ہمسایہ ممالک میں کام کرنے والے جنگجو گروپوں میں شامل کیے جانے کا قوی امکان ہے۔ پاکستان کی حدود سے کام کرنے والے جنگجو گروپ جیشِ محمد کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ اُس نے تو رضا کاروں کی بھرتی شروع بھی کر دی ہے۔ طالبان نے بھارت کو یقین دہانی کرائی ہے کہ افغانستان کی سرزمین جنگجوؤں کے استعمال میں نہیں رہے گی، مگر ابھی یہ واضح نہیں کہ طالبان جنگجوؤں کو روکنے اور ملک کی حدود تک رکھنے کی سکت رکھتے بھی ہیں یا نہیں۔ بھارت کو القاعدہ اور داعش جیسے گروپوں سے بھی خطرات لاحق ہیں۔ نئی دہلی اس بات سے بھی تشویش میں مبتلا ہے کہ افغانستان میں طالبان کی حکومت قائم ہونے سے جنگجوؤں اور انتہا پسندوں کو پاک بھارت سرحدی علاقوں تک پہنچنے میں زیادہ دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ بھارت میں پوزیشن زیادہ مضبوط نہ ہونے پر بھی داعش کرناٹک اور کیرالا جیسی دور افتادہ ریاستوں سے بھی بھرتیاں کرنے میں کامیاب رہی ہے۔ ایسا سوشل میڈیا پر پروپیگنڈے کے نتیجے میں ممکن ہو سکا ہے۔ ایسی اطلاعات بھی ہیں کہ کابل پر طالبان کا تصرف قائم ہو جانے پر جیشِ محمد کے سربراہ نے کابل کا دورہ کیا تاکہ بھارت اور مقبوضہ کشمیر میں سرگرمیوں کی راہ ہموار کی جا سکے۔

انسدادِ دہشت گردی سے متعلق بھارتی ٹاسک فورس نے ۳۱ راگست کو اطلاع دی کہ وہ کم و بیش ۲۵ بھارتی شہریوں پر نظر رکھے ہوئے ہے، جن کے بارے میں شبہ ہے کہ وہ دہشت گردی کے لیے بھرتیاں کرنے میں مصروف ہیں۔

اس وقت افغانستان کے حوالے سے بھارت کے آپشن محدود ہیں۔ ایسے میں بہتر یہ ہے کہ ایک طرف وہ طالبان سے بات چیت جاری رکھے تاکہ اشتراکِ عمل کی راہ ہموار ہو اور دوسری طرف اسٹریٹجک خطرات سے نمٹنے پر بھی نظر رکھے۔ طالبان سے چین اور پاکستان کے تعلقات غیر معمولی نوعیت کے ہیں۔ ایسے میں بھارت کے اثر و نفوذ کا دائرہ سکڑ گیا ہے۔ ایسے میں نئی دہلی ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھے گا اور اس بات کو ذہن نشین رکھے گا کہ افغانستان کی سرزمین کو بھارت کے خلاف استعمال کرنے کی گنجائش ختم کرنی ہے۔ طالبان کی حکومت کو باضابطہ طور پر تسلیم کرنے میں تو کچھ وقت لگے گا تاہم نئی دہلی کی کوشش ہوگی کہ طالبان سے بات چیت کی جاتی رہے تاکہ معاملات کو درست کرنے میں زیادہ سے زیادہ مدد ملے۔ بھارت نے افغانستان میں بنیادی ڈھانچے کو مضبوط کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ پورے خطے کو ایک لڑی میں پرونے والی تجارتی راہداریوں سے بھی جڑا رہنا چاہتا ہے۔ اس بنیاد پر طالبان سے تعلقات بہتر ہو سکتے ہیں اور بھارت کے لیے نئے افغانستان میں کسی نئے کردار کی راہ بھی ہموار ہو سکتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ بھارت انسدادِ دہشت گردی سے متعلق سرگرمیاں بڑھانے کے لیے مقبوضہ جموں و کشمیر کے علاوہ راجستھان اور پنجاب میں تعیناتیاں بھی بڑھا سکتا ہے۔ بھارتی حکومت کا دعویٰ ہے کہ دہشت گرد اب سرحدی علاقوں میں حملوں کے لیے ڈرون استعمال کر رہے ہیں۔ بھارتی فوج کو بھی جدید ترین ڈرون درکار ہیں۔

قطر کی حکومت نے بتایا تھا کہ جون میں بھارتی سفارت کار طالبان سے ملے تھے اور ابتدائی نوعیت کی بات چیت ہوئی تھی تاکہ رابطے قائم کرنے کی راہ ہموار ہو۔ ۳۱ راگست کو دوہا میں بھارتی سفارت کاروں نے طالبان کے نمائندوں سے ملاقات کی تاکہ بدلی ہوئی صورتِ حال میں رابطے بڑھائے جا سکیں۔

افغانستان میں اپنے مفادات کا تحفظ یقینی بنانے کے لیے بھارت اُس کے ہمسایہ ممالک سے مل کر کام کرنا پسند کرے گا۔ بھارت یہ بھی چاہے گا کہ افغانستان میں تعمیرِ نو اور ترقی کے عمل میں بھی اپنا واضح کردار یقینی بنائے۔ افغانستان کی بدلتی ہوئی صورتِ حال میں تنگھائی تعاون تنظیم تیزی سے ابھر کر سامنے آئی ہے۔ اس تنظیم میں چین، روس، پاکستان، ایران، بھارت اور وسطِ ایشیا کی بیشتر ریاستیں شامل ہیں۔ یہ گروپ اس بات کو یقینی بنانے کی کوشش کر رہا ہے کہ افغانستان میں طالبان کی آمد کے بعد پورے خطے کے لیے سلامتی کے حوالے سے کوئی بڑا بحران پیدا نہ ہو۔ بھارت اس پلیٹ فارم کو روس اور ایران کے ساتھ ساتھ پاکستان سے بھی بات چیت کے لیے بروئے کار لانے کی کوشش کرے گا تاکہ افغانستان میں اُس کے مفادات کو مستقل نوعیت کے خطرات لاحق نہ ہوں۔ بھارت کے پاس یہ آپشن بھی موجود ہے کہ وہ افغانستان کی حدود میں طالبان کے خلاف کی جانے والی مسلح جدوجہد کی حمایت کرے مگر بھارتی قیادت یہ آپشن شاید ہی استعمال کرے کیونکہ فی الحال کسی بھی گروپ یا تنظیم میں اتنا دم نہیں کہ طالبان کے قدم اکھاڑ سکے اور پھر یہ بات بھی ہے کہ ایسا کرنے کی صورت میں طالبان سے بھارت کے تعلقات مزید خراب ہوں گے۔ طالبان کے خلاف کی جانے والی مزاحمت کی حمایت اور مدد کرنے سے ملک میں خانہ جنگی بھی شروع ہو سکتی ہے اور اس کے نتیجے میں بہت بڑی تعداد میں افغان باشندے پناہ کی تلاش میں ہمسایہ اور علاقائی ممالک کا رخ کریں گے۔ اس کے نتیجے میں خطے کی سلامتی ایک بار پھر داؤ پر لگ سکتی ہے۔

طالبان سے ایران کے تعلقات کھٹے میٹھے رہے ہیں۔ ایران کا شکوہ ہے کہ طالبان کے دور میں شیعہ افراد پر مشتمل ہزارہ کمیونٹی سے اچھا سلوک روا نہیں رکھا گیا۔ روس کی ساری توجہ اس بات پر ہے کہ خطے کے لیے سلامتی کے حوالے سے کوئی بڑا بحران پیدا نہ ہو اور طالبان کے انقلابی نظریات وسطِ ایشیا کی ریاستوں تک نہ پھیلیں۔ یہ ریاستیں روس کے لیے بنیادی دائرۂ اثر کا درجہ رکھتی ہیں۔

تاجکستان واحد ملک ہے، جس نے عبوری حکومت میں تاجک برادری کے لوگوں کو شامل نہ کیے جانے کی مذمت کی ہے اور تاجکستان ہی کے بارے میں یہ گمان بھی پایا جاتا ہے کہ وہ طالبان مخالف مزاحمتی تحریک کی حمایت و مدد کر سکتا ہے یا کرے گا۔

(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"For India, a Taliban-led Afghanistan marks a painful setback".

("worldview.stratfor.com". Sep. 29, 2021)

سیرتؐ کے موضوع پر اسلامک ریسرچ اکیڈمی کی شائع کردہ کتاب

اوراقِ سیرت ﷺ

مولانا سید جلال الدین عمری

قیمت: ۴۰۰ روپے

اکیڈمی بک سینٹر۔ فون: 021-36809201

حقیقی عالمگیریت کی طرف

ملائیشیا کے سابق وزیر اعظم مہاتر محمد کا شمار اُن سیاست دانوں میں ہوتا ہے جو حکمرانی کے ساتھ ساتھ فکر و نظر کے حوالے سے بھی اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ زیر نظر صفحات اُن کی کتاب "اچیونگ ٹرو گلوبلائزیشن" سے اقتباسات پر مشتمل ہیں۔ ۲۰۰۳ء میں عراق پر امریکا اور اتحادیوں کے حملے کے بعد شائع ہونے والی یہ کتاب ڈاکٹر کوہائی ہاشی موتو نے مہاتر محمد سے دس گھنٹے کی طوالت پر مبنی گفتگو کی مدد سے ترتیب دی تھی۔

ہر ملک میں اس حوالے سے الگ تصور پایا جاتا ہے کہ کسی بھی رہنما کو کب تک خدمات انجام دینی چاہئیں۔ چند ممالک میں تو یہ بھی طے کر دیا جاتا ہے کہ صدر یا وزیر اعظم کو دو میعاد سے زیادہ مواقع نہیں دیے جاسکتے۔ بہت سے ممالک میں عمر کی حد بھی طے کر دی جاتی ہے کہ کسی لیڈر کو کب تک عوام کی رہنمائی اور خدمت کرنی چاہیے۔ ملائیشیا میں ایسا کچھ نہیں ہے۔ اگر میں چاہتا تو بہ حیثیت وزیر اعظم کام کرتا رہتا۔ یہ سلسلہ مرتے دم تک جاری رہتا یا پھر عوام کی جانب سے ہٹائے جانے تک! میرا ذاتی نظریہ یہ ہے کہ کسی بھی لیڈر کو ملک درست کرنے کے بعد رخصت ہو جانا چاہیے۔ میں نے دیکھا کہ ملک اچھی حالت میں ہے، معیشت مستحکم ہے اور پارٹی بھی کمزور نہیں۔ مستعفی ہونے کا اس سے اچھا موقع بھلا کیا ہو سکتا تھا؟

اگر کوئی رہنما مشکل حالات میں اقتدار سے الگ ہو تو آنے والوں کے لیے مشکلات بڑھ جاتی ہیں۔ انھیں کئی طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میں نے اسی لیے حالات بہتر ہونے کا انتخاب کیا۔ اب پارٹی مستحکم ہے، معیشت کا حال اچھا ہے اور ملک بہت اچھے حالات میں ہے۔ مسائل تو آتے جاتے رہیں گے۔ کسی بھی ملک کو پنپنے کا موقع اسی وقت ملتا ہے جب اسے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جب میں نے مستعفی ہونے کا فیصلہ کیا تب میں اپنی بائیس سالہ کارکردگی سے مطمئن تھا۔ اقتدار کے ایوانوں سے رخصت ہونے کا بہترین وقت یہی تھا۔

ملائیشیا میں روایت رہی ہے کہ جب کوئی لیڈر رخصت ہوتا ہے تو چارج اس کا نائب سنبھالتا ہے۔ مئی ۲۰۰۰ء سے میں اپنے نائب کی کارکردگی سے مطمئن تھا۔ انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ حکومتی امور کس طور انجام دیے جاتے ہیں اور مسائل کو کس طرح حل کیا جاتا ہے۔ انھیں معلوم تھا کہ ملک کی پالیسیاں کیا ہیں اور کس طرح نافذ کی گئی ہیں۔ ملائیشیا میں حکومتی ڈھانچا اجتماعی ذمہ داری کے اصول کے تحت کام کرتا ہے۔ ہم کسی بھی معاملے کو ذاتی پسند یا ناپسند کے حوالے سے نہیں کرتے۔ کسی بھی معاملے میں اگر کسی کے پاس کوئی آئیڈیا ہو تو وہ اسے کابینہ میں پیش کرتا ہے، اس آئیڈیے پر غور کیا جاتا ہے اور اگر وہ قابل عمل ہو تو اس کی منظوری دی جاتی ہے۔ اسی صورت وہ آئیڈیا عمل پذیر ہو سکتا ہے۔ میں بھی جب وزیر اعظم تھا تو کابینہ کو اپنے تصورات پر مطلع کرتا تھا۔ ہم جو کچھ بھی کرتے تھے، اجتماعی ذمہ داری کے ساتھ کرتے تھے۔ سوال صرف نئے آئیڈیا کا تھا۔ ہم سب کو اندازہ تھا کہ معیشت کس طرح کام کرتی ہے۔ پالیسیوں میں تھوڑی بہت تبدیلیاں تو رونما ہوتی رہتی ہیں۔ مجھے اپنے نائبین پر پورا بھروسہ تھا۔ مستعفی ہوتے وقت مجھے کسی بات نے تشویش میں مبتلا نہیں کیا۔

ایسٹ ایشین اکنامک کاکس

میں نے دسمبر ۱۹۹۰ء میں مشرقی ایشیا کے ممالک میں اتحاد پیدا کرنے کا تصور پیش کیا تھا۔ ابتدائی مرحلے میں چند ایک مشکلات درپیش تھیں۔ اب میرا تصور "ایشین پلس تھری" کی شکل میں سامنے آچکا ہے۔ میں نے اصلاً یہ تصور پیش کیا تھا کہ یہ ایک طرح کا مشاورتی فورم ہوگا، جس میں مشرقی ایشیا کے ممالک اپنے مسائل پر غور کرتے ہوئے ان کا حل تلاش کیا کریں گے۔ ساتھ ہی یہ بھی سوچا گیا تھا کہ اس فورم کی مدد سے کسی بھی بین الاقوامی مسئلے پر ہم آہنگ ہو کر مشرقی ایشیا کی بات بیان کی جاسکتی ہے۔ اس فورم کو پورے ایشیا پر محیط بنانے کا کوئی ارادہ نہ تھا کیوں کہ یہ بہت بڑا براعظم ہے۔ پورے براعظم کو کسی ایک فورم کے دائرے میں لانا بہت مشکل کام ہے۔ میں نے مشرقی ایشیا کے ایک فورم کا تصور پیش کیا اور بتایا کہ اسے درجہ بہ درجہ توسیع دی جاسکتی ہے۔ یورپی اتحاد کا بھی یہی معاملہ تھا۔ بات دو ممالک سے "یوروپین اسٹیل اینڈ کول کمیونٹی" کی شکل میں شروع ہوئی تھی۔ آج ہمارے سامنے جو یورپی اتحاد موجود ہے اسے اس مقام تک آنے میں پچاس سال لگے ہیں۔ ایشیائی اتحاد کے لیے بھی ایسا ہی سوچا جاسکتا ہے۔ ایشیا بہت بڑا براعظم ہے۔ اس میں زبانوں، نسلوں اور ثقافتوں کا غیر معمولی تنوع پایا جاتا ہے۔ یورپ میں تقریباً سبھی باشندے ایک لسانی گروہ (لاطینی) سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے مابین مذہبی ہم آہنگی بھی موجود ہے۔ اس کے باوجود انھیں متحدہ ہونے، مشترکہ منڈی تشکیل دینے اور مشترکہ کرنسی اپنانے میں پچاس سال لگے۔ ۱۹۹۱ء میں جب ہم نے مشرقی ایشیا کے اتحاد کا تصور پیش کیا تو امریکا کی جانب سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ چین اس تصور کا حامی تھا۔ جنوبی کوریا بھی چاہتا تھا کہ ان خطوط پر سوچا جائے۔ امریکی دباؤ کے تحت جاپان البتہ خاصا مخالف رہا۔ آخر کار امریکی مخالفت کا زور توڑنے کے لیے ایسٹ ایشین اکنامک کوکس کو ایشین پلس تھری میں تبدیل کر کے اپنایا گیا۔

ایشیائی اقوام میں زبانوں، نسلوں، مذاہب اور ثقافتوں کا اس قدر تنوع موجود ہے کہ انھیں متحد ہونے میں پچاس سال سے بھی زیادہ وقت لگ سکتا ہے۔ یورپ ایک مثال کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ اسے دیکھتے ہوئے بہت کچھ سوچا اور کیا جاسکتا ہے۔ اگر پیش رفت سست رفتار بھی ہو تو کیا ہے، مقصود تو اتحاد ہے۔

عراق کے خلاف جنگ اور اس جنگ کی راہ ہموار کرنے والے واقعات کی نوعیت پر غور کرنے سے بین الاقوامی تعلقات کی نئی سمت کا بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ میں ذاتی طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ عراق کے خلاف جنگ معاملات کو بات چیت سے سلجھانے کے بجائے صرف طاقت کے استعمال کے ذریعے طے کرنے کی ذہنیت کی عکاسی کرتی ہے۔ کلیدی مسئلہ یہ ہے کہ امریکا نے فیصلہ سازی کے بین الاقوامی نظام کو یکسر مسترد کر دیا ہے۔ امریکا اپنی طاقت کے زعم میں کسی کی کوئی بات ماننے کو تیار نہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر لیگ آف نیشنز بنائی گئی تھی۔ اس بین الاقوامی تنظیم کے قیام کا بنیادی مقصد جنگ کی راہ مسدود کرنا تھا۔ طے پایا تھا کہ کوئی بھی رکن ملک کسی ملک پر جنگ نہیں تھوپے گا اور جنگ کو صرف دفاعی حکمت عملی کے طور پر اپنائے گا، اور وہ بھی اس وقت کہ جب مفاہمت کے دیگر تمام راستے بند ہو چکے ہوں۔ بعد میں کیا ہوا؟ امریکا اس تنظیم سے نکل گیا جس کے نتیجے میں اس کی تحلیل واقع ہوئی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد ایک بار پھر سوچا گیا کہ جنگ کی راہ کس طرح روکی جائے۔ دونوں عالمی جنگوں میں انسانیت کا اتنے بڑے پیمانے پر نقصان ہوا تھا کہ اب جنگ کو مکمل طور پر روکنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ مہذب معاشرے میں جنگ کی اب کوئی گنجائش نہ رہی تھی۔ دنیا بھر کے سیاسی قائدین نے مل جل کر طے کیا کہ جنگ کو اختلافات ختم کرنے اور تنازعات کی راہ روکنے کے آلے کے طور پر استعمال کرنے سے گریز کیا جائے۔ اور اگر جنگ کرنا ہی ہو تو آخری حربے کے طور پر کی

جائے۔مثلاً کمبوڈیا میں کھمیر روج کے مظالم کا خاتمہ اس گروپ کے خلاف جنگ کی صورت میں ہی ممکن تھا۔ایسی جنگ بھی مذاکرات میں ناکامی کے بعد اقوام متحدہ کی نگرانی میں ہی ممکن تھی۔ایسی کسی بھی صورت حال میں اقوام متحدہ ہی مختلف ارکان سے فوجی طلب کر کے ایک فوج تشکیل دینے کی مجاز تھی۔ چند برس قبل افریقا میں خانہ جنگی نے کم وبیش ۵۰ لاکھ افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔اقوام متحدہ نے اس قتل وغارت کو روکنے کے سلسلے میں کچھ نہ کیا۔بوسنیا میں بھی اقوام متحدہ نے اس وقت مداخلت کی جب سربوں کے ہاتھوں کم وبیش ۲ لاکھ مسلمانوں کا خون ہو چکا۔ان دونوں مثالوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عالمی ادارہ کس حد تک کمزور ہے۔

عراق پر جو جنگ تھوپی گئی اس کی پشت پر بھی اقوام متحدہ نہ تھی۔عراق کی جانب سے کسی حملے کا حقیقی خطرہ بھی نہ تھا۔ایسے میں دفاعی پوزیشن اختیار کرنے کی صورت حال بھی نہ تھی۔ امریکا چاہتا تھا کہ عراق میں ایک ایسی حکومت کا خاتمہ کرے جو اسے پسند نہ تھی۔امریکا نے یہ دعویٰ بھی کیا تھا کہ عراقی حکومت اپنے عوام پر مظالم کے پہاڑ توڑ رہی تھی۔یہ بھی کہا گیا کہ عراق کے پاس وسیع تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں (WMD) کے بڑے ذخائر ہیں۔ظالم حکمران تو دوسرے بہت سے ممالک میں بھی ہیں جو اپنے عوام کو جینے کا حق دینے کو بھی تیار نہیں۔ بہت سے ممالک کے وسیع تر تباہی کے ہتھیار بہت بڑے پیمانے پر موجود ہیں،مگر امریکا ان کے خلاف تو کوئی کارروائی نہیں کرتا۔صاف ظاہر ہے کہ عراق پر جنگ دراصل تیل کے ذخائر پر کنٹرول کے لیے تھوپی گئی۔جن مسائل کی بنیاد پر عراق کے خلاف جنگ کی گئی،اُنہی امور کی بنیاد پر اب ایران اور شمالی کوریا کے خلاف بھی جنگ کا امکان بہت واضح دکھائی دے رہا ہے۔امریکا ان ممالک کی حکومتوں کو بھی پسند نہیں کرتا۔شام پر بھی دباؤ ڈالا جارہا ہے۔اس پر حملہ بھی خارج از امکان قرار نہیں دیا جاسکتا۔ایران اور جنوبی کوریا کے علاوہ سوڈان اور لیبیا پر بھی امریکا ''شیطانی محور'' کا جز ہونے کا الزام عائد کرتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ حکومت کی تبدیلی کے لیے ان ممالک کو بھی نشانہ بنایا جائے۔ظاہر یہ ہوتا ہے کہ اب جس ملک پر بھی امریکا کی جانب سے وسیع تر تباہی کے ہتھیار رکھنے کا شک ظاہر کیا جائے گا اس پر حملے کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جاسکتا۔

ہمیں یہ بات نہیں بھولنا چاہیے کہ دنیا بھر میں وسیع تر تباہی کے ہتھیاروں کا سب سے بڑا ذخیرہ امریکا میں ہے۔ اس نے اعلان کر رکھا ہے کہ ایٹمی ہتھیار انتہا کے طور پر بنائے گئے ہیں۔مگر اس کے باوجود امریکا واضح اشارے دیتا رہا ہے کہ وہ مخصوص حالات میں ایٹمی ہتھیار استعمال کرسکتا ہے۔اگر کوئی چھوٹا ایٹمی ہتھیار بھی استعمال کیا جائے تو تباہی کا دائرہ محدود کرنا ممکن نہیں رہتا۔یہ سوال ذہن میں ابھرے بغیر نہیں رہتا کہ ایٹمی حملے کے سامنے ثابت قدم رہنے کی سکت کس میں ہوسکتی ہے؟ پیشگی حملے کا نظریہ بھی امریکا نے ہی وضع اور پیش کیا ہے۔اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس ملک سے کوئی خطرہ محسوس ہو اس پر حملہ کردیا جائے۔اور اس کا جواز یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اگر آپ حملہ نہیں کریں گے تو وہ ملک حملہ کرگزرے گا۔عراق پر تھوپی جانے والی جنگ اس کی بہت واضح مثال ہے۔ امریکا نے اپنے طرز عمل سے ثابت کیا ہے کہ وہ مشاورت اور فیصلہ سازی کے کسی بھی عالمی سیٹ اپ کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں اور دنیا کا طاقت ور ترین ملک ہونے کی بنیاد پر وہ کچھ بھی کرگزرنے کو اپنا حق سمجھتا ہے۔امریکا نے دنیا پر جتا دیا ہے کہ وہ جو چاہے کرسکتا ہے،اور وہ بھی اس تیقن کے ساتھ کہ اسے ایسا کرنے کا اجازت نامہ حاصل ہے!

کیا اس امر میں کسی نوع کے شک کی گنجائش ہے کہ جنگ سے صرف قتال اور تباہی کی راہ ہموار ہوتی ہے؟ مشرقی تہذیب میں امن قائم کرنے اور جنگ وجدل سے گریز پر بہت زور دیا گیا ہے۔مشرقی دنیا کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مقاصد کے حصول کے لیے جنگ ہی واحد راستہ نہیں،مذاکرات کے ذریعے بھی بہت کچھ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ملائیشیا عراق میں جنگ کا حامی تھا،نہ ہے۔میرا اپنا نقطۂ نظر یہ تھا کہ بین الاقوامی تعلقات کی بنیاد عسکری تعلقات پر نہیں ہونا چاہیے۔مذاکرات سے معاملات کو سلجھانے اور کشیدگی کم کرنے میں خاطر خواہ مدد ملتی ہے۔ہمیں کشیدگی زائل کرنے کی راہ ہموار کرنا چاہیے۔ اس کے لیے ایک دوسرے کی بات سننا ناگزیر ہے۔جب تک ہم اس کے لیے تیار نہ ہوں گے،کسی بھی اعتبار سے امن کے استحکام کی جانب نہیں بڑھ سکیں گے۔جنگ یہ ثابت کرتی ہے کہ طاقت ور ہمیشہ فتح یاب ہوتا ہے،خواہ وہ حق پر نہ ہو!امریکا کو عراق کے خلاف جنگ سے باز رکھنے کی کوشش کسی نے نہیں کی؟ فرانس چاہتا ہے کہ یہ معاملہ عالمی برادری کے سامنے رکھا جائے،تمام ممالک سے رائے لی جائے تاکہ متفقہ فیصلے کے تحت کارروائی کی جائے۔جرمنی اور روس بھی عراق پر جنگ تھوپنے کے خلاف تھے۔امریکا نے تمام بااثر ممالک کی رائے کو بھی یکسر نظر انداز کرتے ہوئے دنیا کو بتادیا کہ وہ جس کام کو خود درست سمجھے گا،کرگزرے گا۔

اب یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ عراق سے امریکی سلامتی کو کوئی ایسا خطرہ لاحق نہ تھا،جس کی بنیاد پر جنگ جیسی بڑی کارروائی ناگزیر قرار دی جاسکتی۔امریکا کا دعویٰ تھا کہ عراق کے پاس وسیع تر تباہی کی ہتھیاروں کے ذخائر موجود ہیں۔ عراقیوں نے اپنے دفاع میں ان ہتھیاروں کو کسی بھی مرحلے پر استعمال نہ کیا۔اس کا سبب یہ تھا ان کے پاس یہ ہتھیار تھے ہی نہیں۔ابھی تک امریکا نے باضابطہ طور پر تسلیم نہیں کیا کہ اس نے عراق پر جنگ تھوپ کر ہر اعتبار سے غلطی کی تھی۔عراق پر امریکی حملے کا مقصد دنیا کو یہ باور کرانا تھا کہ اگر اس کی بات نہ مانی جائے تو وہ کسی بھی حد تک جاسکتا ہے۔جو کچھ امریکا نے عراق میں کیا ہے اس کا مشاہدہ کرکے دنیا پر خوف طاری ہے۔ بالخصوص اسلامی دنیا پر زیادہ لرزہ طاری ہے۔اسلامی ممالک کو یہ پیغام ملا ہے کہ اگر اس نے امریکی مطالبات تسلیم نہ کیے تو بمباری اور قتل وغارت کا سامنا کرنا پڑے گا۔عراق کے خلاف جنگ ہم سے کہتی ہے کہ امریکا کی بات مان لو،یا پھر حملے کے لیے تیار ہوجاؤ۔بین الاقوامی تعلقات کے لیے یہ کوئی خوش کن پیغام ہرگز نہیں۔کوئی ملک خواہ کتنا طاقت ور ہو،اسے اپنے ہی طے کردہ چند ایک اصولوں کا تو پابند ہونا ہی چاہیے۔انصاف قائم کرنے کے نام پر کسی ملک کو نشانہ بنانا اور تباہی سے دوچار کردینا کسی بھی اعتبار سے کوئی قابل تقلید نظریہ نہیں۔

امریکا کی مٹھی میں بند دنیا!

کون ہے جو اس بات کو درست تسلیم کرنے سے انکار کرے گا کہ امریکا نے عراق پر حملہ تیل کی دولت پر اپنا تسلط جمانے کے لیے کیا؟ مگر یہ واحد سبب نہیں۔امریکا درحقیقت دنیا کو بتانا چاہتا تھا کہ وہ اس حد تک طاقت ور ہے کہ کسی کو خاطر میں لانے کا پابند نہیں۔اور یہ کہ وہ جو کچھ بھی چاہے گا، کرے گا۔وہ دنیا پر اپنی برتری ثابت کرکے اسے منوانا چاہتا ہے۔اس نے یہ پیغام سب پر واضح کردیا ہے کہ جو اس کا حکم نہیں مانے گا وہ جنگ کا خطرہ مول لے گا۔

بہت سے سرکردہ امریکی سیاست دان اور سیاسی تجزیہ نگار اب ایک ایسی دنیا کی بات کھل کر کرنے لگے ہیں جس کا مکمل کنٹرول امریکا کے ہاتھ میں ہو۔انگریزی میں اسے Pax Americana کہا جاتا ہے۔پوری دنیا کو امریکی مٹھی میں بند کرنے کا خواب دیکھنے والے یہ بات بھول رہے ہیں کہ اس دنیا میں تہذیبی،نسلی،لسانی اور مذہبی تنوع بہت زیادہ ہے۔دنیا پر حکومت کرنا کسی ایک ملک کے لیے ممکن نہیں۔چند ایک ممالک پر حملہ ضرور کیا جاسکتا ہے،تاہم انھیں مکمل طور پر

اپنا تابع اور باج گزار بنانا ممکن نہیں۔ کسی ملک پر قبضہ کرنے کے بعد وہاں معاملات کو معمول کے مطابق چلانا ممکن نہیں۔ اگر کوئی ملک پوری دنیا کو اپنے بس میں کرنا چاہے گا تو معاملات کو الجھائے گا اور کشیدگی میں اضافہ کرے گا، جیسا کہ امریکا نے ثابت بھی کیا ہے۔

عراق پر حملے سے کچھ دن قبل میں اسلامی کانفرنس کی تنظیم کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے قطر کے دارالحکومت دوہا میں تھا۔ اس اجلاس میں چند اسلامی ممالک نے خود کو امریکا نواز ثابت کیا۔ چند ممالک عراق کے خلاف جنگ کے حق میں نہ تھے۔ کسی بھی اسلامی ملک نے عراق جنگ کے حوالے سے واضح موقف اختیار نہ کیا۔ ہاں، عراق پر جنگ تھوپے جانے کے بعد سے اسلامی ممالک میں امریکا کے لیے مخالفت اور نفرت بڑھی ہے۔ امریکا نواز گردانے جانے والے ممالک میں بھی امریکا کے خلاف شدید جذبات پائے جاتے ہیں۔ چند ایک اسلامی ممالک میں اسامہ بن لادن سے ہمدردی رکھنے والوں کی تعداد میں بھی خاصا اضافہ ہوا ہے اور وہ اس رائے کے حامل ہیں کہ اسامہ بن لادن اور ان کے ساتھیوں کو امریکا کے خلاف جدوجہد جاری رکھنا چاہیے۔ امریکی جارحیت نے منفی رجحانات کو پروان چڑھانے میں مرکزی کردار ادا کیا ہے۔

طاقت کے بے محابا استعمال اور اپنی اقدار دوسروں پر تھوپنے کے نتیجے میں صرف کشیدگی، نفرت اور مخاصمت پیدا ہوتی ہے۔ کچھ لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ امریکا الگ تھلگ ہوتا جارہا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد قائم ہونے والی لیگ آف نیشنز سے وہ الگ ہوا تھا۔ مگر اب وہ ایسا نہیں کر رہا۔ امریکا نے کسی بھی بین الاقوامی تنظیم سے علیحدگی اختیار نہیں کی ہے۔ اب تک وہ اقوام متحدہ کا رکن ہے اور اس ڈھانچے میں رہتے ہوئے وہ چاہتا ہے کہ اس کی بات تسلیم کی جائے، اور کسی بھی معاملے میں اس سے اختلاف کا اظہار نہ کیا جائے۔ امریکا ماضی کے برعکس عالمی اداروں سے نہ صرف یہ الگ نہیں ہو رہا، بلکہ ان اداروں کو اپنی مرضی کے تابع بنانا چاہتا ہے۔ اس امریکی خواہش کے نتیجے میں عالمی اداروں کا کیا حشر ہوا ہے، یہ کسی سے پوشیدہ بھی نہیں۔ امریکا نہ صرف یہ کہ عالمی برادری سے الگ تھلگ نہیں ہو رہا، بلکہ پوری دنیا کو اپنے رنگ میں رنگنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی زبان، طرز زندگی، معاشی اصول، وضع قطع غرض یہ کہ ہر معاملہ دوسروں پر مسلط کرکے انھیں دست نگر بنانے کے فراق میں ہے۔ دوسروں کی رائے اس کے نزدیک کچھ وقعت نہیں رکھتی۔ عالمی برادری عراق کے خلاف جنگ کے حق میں نہیں تھی۔ امریکا نے دنیا کی بات نہ مانی اور اپنی مرضی سب پر تھوپی۔ عالمی رائے عامہ کو ٹھکرانے کا رویہ امریکا کی دونوں بڑی سیاسی جماعتوں میں نمایاں ہے۔ عراق کے مسئلے پر ڈیموکریٹک اور ری پبلکن پارٹی کے قائدین اور سرکردہ عہدیداروں میں کچھ زیادہ اختلاف رائے نہیں پایا گیا۔ اہم عالمی امور پر امریکی پالیسی ترتیب دینے کے معاملے میں امریکا کی دونوں بڑی سیاسی جماعتوں کی سوچ یکساں ہے۔

۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کے واقعات کے بعد سے امریکی فوج اور اسلامی دنیا کے مسلح گروپوں کے مابین لڑائی جاری ہے۔ پہلے افغانستان میں طالبان کے خلاف کارروائی کی گئی اور اس کے بعد عراق پر جنگ تھوپی گئی۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو خدشہ ہے کہ کہیں وسیع تر تناظر میں اسے تہذیبوں کے تصادم سے تعبیر کیا جانے لگے گا۔ اس میں ایک طرف ''رب کی خوشنودی'' کی حامل عیسائیت ہوگی اور دوسری طرف ''شر کی علامت'' سمجھا جانے والا اسلام ہوگا! حقیقت یہ ہے کہ مغرب کو اسلامی دنیا سے ہمیشہ شکایات رہی ہیں۔ مغرب کے حکمران جو کچھ اسلام کے بارے میں سوچتے ہیں اس کا اظہار ان کی اگریشن اور دیگر پالیسیوں سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ عراق کے خلاف جذبات بھڑکائے گئے۔ اس معاملے کو غیر ضروری طور پر سیاسی رنگ دیا گیا۔ اس سے قبل مغرب میں عمومی طور پر عراق سے محض اس لیے نفرت کرنے کا رجحان نہ تھا کہ وہ اسلامی ملک تھا۔ مسلم دنیا کی اکثریت بھی عیسائیوں کو دشمن نہیں سمجھتی۔

امریکی افواج اور مسلم مسلح گروپوں کے مابین جو لڑائی جاری ہے وہ کسی بھی نقطۂ نگاہ سے تہذیبی تصادم نہیں۔ کچھ لوگ اپنے سیاسی عزائم کی تکمیل کے لیے اسے تہذیبی تصادم کا نام دے کر کشیدگی بڑھا رہے ہیں۔ مشرق وسطیٰ میں تہذیبوں کے مابین کشیدگی واضح ہے، مگر اس کے باوجود اسرائیلیوں کے خلاف فلسطینیوں کی لڑائی کو تہذیبوں کا تصادم قرار نہیں دیا جاتا۔ ۱۹۹۳ء میں امریکی سیاسی تجزیہ نگار سیموئل ہنٹنگٹن نے ''تہذیبوں کا تصادم'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس نے سیاسی تجزیہ نگاروں کے حلقوں میں تہلکہ مچایا تھا۔ اس نے اس مضمون کو وسعت دے کر ۱۹۹۴ء میں اسی عنوان سے کتاب لکھی جو خاصی تنازع فیہ ٹھہری ہے۔ اس کتاب میں ہنٹنگٹن نے لکھا ہے کہ مغرب کو اپنی عسکری اور سیاسی برتری قائم کرنے کے لیے ہمیشہ کسی نہ کسی دشمن کی ضرورت رہی ہے۔ کسی دشمن کی موجودگی کو جواز بنا کر وہ اپنی عسکری قوت میں اضافہ کرتا رہا ہے۔ اگر مسلم اور عیسائی دنیا میں تصادم کی کیفیت پیدا ہوئی تو اسرائیل کو بھی فلسطینی علاقوں پر حملے کرنے، ان پر قبضہ جمانے اور فلسطینیوں کو زیر نگیں کرنے کا جواز مل جائے گا۔ میں نہیں سمجھتا کہ تمام عیسائی اس بات سے اتفاق کرتے ہوں گے کہ مسلمانوں سے ہمیشہ محض اس بنیاد پر جنگ کی حالت میں رہا جائے کہ وہ مسلمان ہیں۔ اس وقت امریکا اور اسلامی ممالک کے مختلف گروپوں کے مابین جو لڑائی جاری ہے وہ کسی بھی لحاظ سے تہذیبوں کا تصادم نہیں۔ ایسا یہ ہے کہ کسی بھی واقعے پر تہذیبوں کے تصادم کا لیبل چسپاں کردیا جاتا ہے۔ اس صورت میں کشیدگی اور نفرت بڑھے گی۔ جب بھی اسلام اور عیسائیت کی بات کی جائے گی تو متعلقہ افراد کسی نہ کسی کیٹیگری کا حصہ تو ہوں گے ہی۔

ایران کے سابق صدر محمد خاتمی نے تہذیبوں کے تصادم کے مقابل تہذیبوں میں مکالمے کا نظریہ پیش کیا۔ میں اس نظریے کا حامی ہوں۔ میری رائے یہ ہے کہ دنیا کی کوئی بھی تہذیب جامع نہیں۔ سب کی اپنی اپنی خوبیاں اور خامیاں ہیں۔ بات چیت ہونا چاہیے تاکہ کشیدگی کم کرنے میں مدد ملے۔ تہذیبی برتری کا موجودہ اور مقبول تصور دراصل جامعیت یا اقدار کی برتری پر نہیں، بلکہ معاشی و عسکری قوت کے ارتکاز پر ہے۔ کسی بھی تہذیب کو برتر قرار دینے کا سمجھنے کا یہ معیار غلط ہے۔ طاقت ور ہمیشہ حق پر نہیں ہوتا۔ بہتر یہ ہے کہ تمام تہذیبوں کے لوگ مل جل کر اس دنیا کو زیادہ سے زیادہ پرامن بنانے کے لیے کام کریں تاکہ کشیدگی کا خاتمہ ہو اور مثبت اقدار کے فروغ کی راہ ہموار ہو۔

جدید دنیا میں ماحول کچھ ایسا ہے کہ صرف جمہوریت کو ہی قبول کیا جارہا ہے۔ طاقت ور ممالک نے کچھ ایسے حالات پیدا کیے ہیں کہ کسی بھی ملک کے لیے جمہوریت کی مغربی شکل اپنائے بغیر چارا نہیں۔ جو ملک جمہوری اقدار کو پروان چڑھانے کے لیے تیار نہ ہو اسے حملے اور قبضے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ کسی بھی جنگ میں شکست سے دوچار ملک کو جمہوریت کی جانب لے جانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جمہوریت میں ہر انسان کو اپنی رائے دینے کا حق ملتا ہے۔ کسی پر بھی کوئی چیز تھوپی نہیں جاتی۔ مگر مفتوح ملک پر جمہوریت تھوپی جاتی ہے۔ اس کے پاس جمہوریت کو اپنانے کے سوا راستہ باقی نہیں رہتا۔ کسی بھی ملک کو اپنی مرضی کی جمہوریت قبول کرنے پر مجبور کرنا کسی طور درست نہیں۔ اور یہ معاملہ اس وقت زیادہ پیچیدہ ہو جاتا

ہے جب کسی ملک کو کوئی ایسا نظام جمہوری قرار دے کر اپنانے پر مجبور کیا جائے جسے وہ جمہوری گردانتا ہی نہ ہو! مزید برآں یہ تصور بھی انتہائی غلط اور خطرناک ہے کہ دنیا میں اگر حقیقی جمہوریت ہے تو صرف مغرب میں۔ جمہوریت کے کئی روپ ہیں۔ جمہوری سیٹ اپ کی ہر شکل میں چند خوبیاں ہیں اور چند خامیاں۔ جمہوریت کی کوئی بھی شکل ہر اعتبار سے مکمل نہیں۔ ہر معاشرے کی ضرورت کے مطابق جمہوری سیٹ اپ میں تبدیلیاں کی جاسکتی ہیں۔

دنیا ایک ایسے موڑ پر کھڑی ہے جہاں کمزور ممالک کے پاس صرف ایک راستہ رہ گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ انھیں جمہوریت اپنا لینی چاہیے۔ کمیونسٹ ممالک بھی خود کو جمہوری کہتے ہیں، تاہم ان کے اس دعوے کو مسترد کر دیا جاتا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ وہ مغربی طرز کی جمہوریت کا نمونہ پیش کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ یہ ممالک ہر وقت حملے اور قبضے کے خطرے سے دوچار ہیں۔ مثلاً شمالی کوریا خود کو ''عوامی جمہوریہ کوریا'' کہتا ہے، تاہم مطلق العنان حکومت کے باعث اسے بھی حملے کے خطرے کا سامنا ہے۔

سوال صرف جمہوریت کو اپنانے کا نہیں ہے، بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہر ملک کو امریکی انداز کا لبرل ڈیموکریٹک سیٹ اپ اپنانا ہوگا۔ ایسے میں کشیدگی، تصادم، محاذ آرائی، اور عدم استحکام کا پیدا ہونا فطری امر ہے۔ ہر معاشرہ جمہوریت کو اپنے مزاج کے مطابق اپناتا ہے۔ جمہوریت کی کوئی بھی شکل اتنی جامع نہیں کہ ہر معاشرے پر اطلاق پذیر ہو۔

کسی بھی سیاسی نظام کو راتوں رات تبدیل کرنا ممکن نہیں۔ ہر معاشرے کی اپنی روایات ہوتی ہیں، جنھیں کسی جواز کے بغیر ختم نہیں کیا جاسکتا۔ یورپ کی تاریخ شاہد ہے کہ جمہوریت کی موجودہ شکل تک پہنچنے میں اس نے ۲۰۰ سال صرف کیے ہیں۔ کسی بھی معاشرے کا جمہوریت کو اپنانے کی جانب بڑھنا مرحلہ وار عمل ہے۔ جمہوریت کے ابتدائی دور میں خواتین کو ووٹ دینے کا حق حاصل نہ تھا۔ سوئزرلینڈ میں بھی خواتین کو ووٹ دینے کا حق بیسویں صدی کے اواخر میں ملا۔

جمہوریت نے موجودہ منزل تک پہنچنے میں خاصا وقت لیا ہے۔ یہ کئی مراحل سے گزری ہے۔ کسی بھی نظام کی خوبیوں اور خامیوں کا علم اسی وقت ہوسکتا ہے جب اسے مکمل طور پر اپنایا جائے۔ اسی صورت اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس مخصوص نظام کی حدود میں رہتے ہوئے کیا ممکن ہے اور کیا ممکن نہیں ہے۔ آزادی مفت نہیں ملتی۔ کسی بھی کام کو کسی ایک جگہ بہتر طور کیا جاسکتا ہے۔ ہر اقدام ہر جگہ ممکن نہیں۔ یہی سبب ہے کہ جمہوریت کی درجنوں اشکال پائی جاتی ہیں۔ ہمیں جمہوریت کی ہر شکل کا احترام کرنا چاہیے، کیوں کہ وہ طویل عمل کے ذریعے موجودہ منزل تک پہنچی ہے۔ اس مرحلے پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ عراق میں جمہوریت متعارف کرانے کا امریکی تجربہ ناکامی سے ہی دوچار رہوگا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جمہوریت اس وقت حکومتی نظام کی بہترین شکل ہے، تاہم ہر اعتبار سے جامع تو یہ بھی نہیں۔ جمہوریت کی سب سے بڑی کمزوری بدعنوانی ہے۔ جمہوری حکومتوں کے ساتھ بدعنوانی کا دم چھلا جڑا رہا ہے۔ جو لوگ خود کو انتخاب کے لیے عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں وہی بدعنوان ہیں۔ سیاست دان چوں کہ اپنی مقبولیت برقرار رکھنا چاہتے ہیں اس لیے وہ ووٹرز کو خوش کرنے کے اقدام بھی کرتے رہتے ہیں۔ بعض حالات میں وہ ووٹرز کو رشوت دینے سے بھی باز نہیں آتے۔ چند علاقوں میں ترقیاتی منصوبے زیادہ عمدگی سے تکمیل کو پہنچتے ہیں۔ دوسرے بہت سے علاقوں کے لوگ ترستے ہی رہ جاتے ہیں۔ جمہوری سیٹ اپ میں عوام خود کو طاقت کا سرچشمہ سمجھتے ہیں اس لیے اپنے مطالبات منوانے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ سیاست دانوں پر دباؤ بھی ڈالتے ہیں۔ نتیجتاً فنڈ کی بے ہنگم تقسیم دکھائی دیتی ہے۔ جمہوریت عوام کو طاقت ضرور بخشتی ہے، مگر انھوں نے بدعنوانی کے پہلو کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ بہت سے سیاست دان مذہب کے نام پر ووٹ لیتے ہیں۔ وہ عوام کو اس بات پر مجبور کرتے ہیں کہ وہ مذہب کی بنیاد امیدوار یا پارٹی کا بائیکاٹ کریں۔ مذہب کا اس نوع کا استعمال بھی بدعنوانی کی ہی ایک شکل ہے۔ دل خراش حقیقت یہ ہے کہ بدعنوانی جمہوریت کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔

امریکی سیاست میں بھی وہی لوگ زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں جو امیدواروں کو زیادہ چندہ دیتے ہیں۔ جن علاقوں سے امیدواروں کو زیادہ چندہ نہیں ملتا، ان کے لیے کچھ خاص منصوبے بھی سامنے نہیں آتے۔ برطانیہ کا بھی یہی حال ہے۔ خود ووٹر بھی بدعنوان ہیں۔ ایسے میں اگر جمہوریت بدعنوان ٹھہرے تو اس میں استعجاب کا کیا پہلو ہے؟

اگر کسی معاشرے میں لوگوں کو طویل مدت تک جمہوریت کا ساتھ نصیب ہو تو وہ اس نظام میں پائی جانے والی بدعنوانی کو سمجھنے اور اس کا تدارک کرنے میں بھی کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اگر کسی سیاسی نظام کا تسلسل یقینی نہ بنایا جائے تو عوام اس سے بہتر طور پر آشنا نہیں ہو سکتے۔ اگر کسی معاشرے میں لوگوں کو اچانک ووٹ کا حق دے دیا جائے، تو ممکن ہے کہ وہ راتوں رات ملنے والی اس آزادی کو غلط ڈھنگ سے استعمال کریں۔ عین ممکن ہے کہ وہ بدعنوان لوگوں کو منتخب اداروں کی زینت بنا دیں۔ جمہوریت میں بہت سی خامیاں ہیں جنھیں سمجھنا ناگزیر ہے۔ ایٹم بم استعمال کرنے والا واحد ملک، امریکا، جمہوری طرز حکومت کا حامل ہے۔ جس طرح دیگر نظام ہائے سیاست و حکومت میں خامیاں پائی جاتی ہیں اسی طرح بشری خامیوں سے جمہوریت بھی پاک نہیں۔

جمہوریت منتخب کرنے کا حق دیتی ہے، مگر اس کا غلط مطلب لے لیا گیا ہے۔ اس حق کے غلط استعمال سے نراجیت پھیلتی ہے۔ بہت سے لوگ یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ صدام حسین کے دور کا عراق آج کے عراق سے بہتر تھا۔ جمہوریت میں حزب اختلاف جو کردار ادا کرتی ہے وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ نئی منتخب حکومت کو کام نہیں کرنے دیا جاتا۔ اس میں صرف خامیاں تلاش کی جاتی ہیں۔ حزب اختلاف کو کسی نہ کسی معاملے میں حکومت پر تنقید کرنے کے موقع کی تلاش رہتی ہے۔ ٹانگ کھینچنے کا عمل جاری رہتا ہے۔ ایسے میں حکومت کو بہتر ڈھنگ سے کام کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ جس حکومت کو احتجاج، مظاہروں، ہڑتالوں اور دھرنوں کا سامنا ہو اس کا انجام کیا ہوسکتا ہے؟ حزب اختلاف کی ریشہ دوانیوں سے حکومت گرتی ہے اور انتخابات میں حزب اختلاف کو حزب اقتدار بننے کا موقع ملتا ہے۔ اب سابق حزب اقتدار کو حزب اختلاف میں بیٹھنا پڑتا ہے۔ وہ بھی حکومت کو کمزور کرنے اور گرانے کے لیے کوشاں رہتی ہے۔ یہ منحوس چکر چلتا ہی رہتا ہے اور عوام کو بے روزگاری اور معاشی بحران کا سامنا رہتا ہے۔

جمہوریت کو اپناتے وقت اس کی تمام خوبیوں اور خامیوں کو ذہن نشین رکھنا چاہیے تاکہ ضرورت پڑنے پر کسی بھی تبدیلی کی راہ ہموار کرنا دشوار نہ ہو۔ جمہوریت ایک ایسا عمل ہے جو درجہ بہ درجہ ہی اپنایا جاسکتا ہے۔ جس معاشرے کو عشروں تک مطلق العنانیت کا سامنا رہا ہو وہ جمہوریت کو پہلی کوشش میں مکمل طور پر نہیں اپنا سکتا۔ کسی بھی نظام کو راتوں رات اپنانا انتہائی خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ کسی نظام کو اپنانے میں سست رفتاری اس لیے بہتر طریقہ ہے کہ اس صورت میں کسی بھی پیچیدگی کو کنٹرول کرنا آسان ہوتا ہے۔ بہت تیزی سے سب کچھ تبدیل کرنے کی خواہش ہر معاملے کو بگاڑ دیتی ہے۔ ایسے میں نراجیت پیدا ہوتی ہے اور کوئی بھی ادارہ صحیح

ڈھنگ سے کام نہیں کر پاتا۔ نئے نظام سے واقفیت نہ رکھنے والے لوگ آزادی کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں اور اس کا غلط استعمال روکنا عموماً ممکن نہیں ہوتا۔

دہشت گردی

۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کے واقعات کے بعد سے یہ خدشہ پروان چڑھتا رہا ہے کہ امریکا کے خلاف دہشت گردی کا دائرہ وسعت اختیار کرے گا اور یہ پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے گی۔ عراق میں امریکا اور اس کے اتحادیوں کی جانب سے جنگ چھیڑنے کے بعد سے معاملہ مزید الجھ گیا ہے۔ عراقی روایتی جنگ تو ہار گئے، اب وہ گوریلا جنگ ہی لڑ سکتے ہیں اور لڑ رہے ہیں۔ اس ضمن میں خاص طور پر یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اگر آپ کسی بھی حملہ آور ہو رہے ہوں تو آپ کے پاس اس کا معقول جواز ضرور ہونا چاہیے۔ امریکا اگر دہشت گردی کا خاتمہ چاہتا ہے تو اس کے بنیادی اسباب پہلے ختم کرنا ہوں گے۔

۱۱ستمبر کے واقعات فلسطینیوں کے مقابل یہودیوں کی مسلسل حمایت کا نتیجہ تھے۔ اسرائیلیوں کے ہاتھوں فلسطینی بہت بڑے پیمانے پر شہید ہوتے رہے ہیں۔ نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملہ کرنے والے مشرق وسطیٰ کے واقعات سے دل برداشتہ تھے۔ اگر ۱۱ستمبر کے سے واقعات کا اعادہ روکنا ہے تو فلسطینیوں اور اسرائیلیوں کے مابین لڑائی رکوانا ہوگی۔

امریکا اپنے طرز عمل سے ثابت کرتا رہا ہے کہ اس کی سوچ یہ ہے کہ سب سے زیادہ طاقت ور ہونے کی بنیاد پر وہ کچھ بھی کر سکتا ہے، کسی بھی معاملے کو طاقت سے کچل سکتا ہے۔ امریکیوں پر اسرائیلیوں کا نفسیاتی غلبہ اس قدر ہے کہ انھوں نے دہشت گردی کے رجحان کو کچلنے میں ناکام ہونے کے بعد اب وہی طریقہ اختیار کیا ہے جو اسرائیلیوں کا ہے۔ دہشت گردوں کو دہشت زدہ کرنے کے اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ یعنی یہ کہ اگر کوئی دہشت گردی کر رہا ہے تو جواباً اس سے بڑی دہشت گردی کرو! اسرائیلی حکام فلسطینی خودکش حملہ آوروں کے مکانات تباہ کر دیتے تھے اور پوری آبادی کو تاراج کر دیا جاتا تھا۔ یہی کچھ امریکا نے بھی کرنے کی ٹھانی ہے۔ یہ انتقامی رویہ معاملات کو مزید الجھا رہا ہے۔ امریکا کو سمجھنا ہوگا کہ دہشت گردی کو ختم کرنے کا موثر طریقہ یہ نہیں ہے کہ بڑی دہشت گردی سے جواب دیا جائے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس حوالے سے امریکا اپنی سوچ اور عملی طریقوں میں کوئی تبدیلی لانے کے لیے تیار نہیں۔ عراق سے نمٹنے کے بعد امریکا دیگر ممالک کا رخ کر سکتا ہے۔ مشرقی یورپ بھی اس حوالے سے خاصا پریشان ہے۔

میڈیا کی آزادی

اس تصور کو خصوصی طور پر پروان چڑھایا جا رہا ہے کہ خلیج کی جنگ کے مقابلے میں عراق کی جنگ کی کوریج خاصی معروضی ہے، یعنی معاملات کو جوں کا توں بیان کیا جا رہا ہے۔ اس کا جواز یہ بیان کیا جا رہا ہے کہ امریکی رپورٹرز چوں کہ امریکی فوج کے ساتھ اس کی گاڑیوں میں سفر کر رہے ہیں اس لیے وہ واقعات کو زیادہ باریکی سے دیکھ سکتے ہیں۔ معروضیت کے دعوے کے لیے پیش کی جانے والی یہ دلیل خاصی بھونڈی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکا اور یورپ سمیت کہیں بھی پریس آزاد نہیں۔ ایک طرف تو پریس یا پرنٹ میڈیا پر حکومتی دباؤ ہوتا ہے، اور دوسری طرف اخباری مالکان یا مدیران بھی اخبارات اور جرائد کو کنٹرول کرتے ہیں۔ رپورٹ مرڈوک نیوز کارپوریشن کئی چینلز کے علاوہ اخبارات اور جرائد کی بھی مالک ہے۔ کسی زمانے میں کسی ایک ادارے کو بیک وقت پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کی فیلڈ میں آنے سے روکا جاتا تھا۔ اب ایسا نہیں ہے۔ اب اخباری ادارے اپنے چینلز بھی لا رہے ہیں۔ اس رجحان کی خرابی بھی سب پر عیاں ہے۔ ایک ہی شخص اگر پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کا مالک ہو تو کسی بھی خبر کو بہتر طور پر کنٹرول کر سکتا ہے۔ رپورٹ مرڈوک کا اپنا ایجنڈا ہے، جس پر وہ اپنے اداروں کے ذریعے عمل کرتا ہے۔ مرڈوک کے چینلز اور اخبارات میں وہی کچھ شائع ہوتا ہے جو اس کی مرضی اور ایجنڈے کے مطابق ہوتا ہے۔ میڈیا اپنی مرضی سے جو چاہتے ہیں شائع کرتے ہیں۔ سوال صرف ان پر تھوپی جانے والی سینسر شپ کا ہی نہیں ہے، ہم یہ بات کس طرح نظر انداز کر سکتے ہیں کہ وہ بہت کچھ اپنے طور پر بھی سینسر کرتے ہیں۔ میں نے جاپان میں منعقدہ ایک کانفرنس میں مندوب کی حیثیت سے شرکت کی اور تقریر بھی کی۔ اگلے دن صبح جب میں بیدار ہوا تو یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ میری تقریر کے مندرجات پیش کرنا تو رہا ایک طرف، رپورٹس میں یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ میں نے اس کانفرنس میں شرکت کی تھی! کیا اس سے یہ تاثر نہیں ملتا کہ میڈیا آزاد نہیں ہیں؟ کانفرنس سے اپنے خطاب کے دوران میں نے ایشیائی ممالک میں یورپی رجحانات کی تقلید کے رجحان پر نکتہ چینی کی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ ایشیائی کسی بھی معاملے میں اپنے طور پر کچھ کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ وہ یورپ کی اندھی تقلید کرنے پر کمربستہ ہیں اور جو غلطیاں یورپ سے سرزد ہوئی ہیں، وہی ان سے بھی سرزد ہو رہی ہیں۔ میں نے ایشیائیوں کی کمزوری کی بات کی تھی، اور ساتھ ہی ساتھ مغرب پر تنقید بھی۔ ایک سابق امریکی وزیر دفاع بھی اس کانفرنس میں شریک تھے۔ جاپانی حکومت نے مناسب نہ سمجھا کہ مغرب پر تنقید کو شائع ہونے دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ کسی نہ کسی نے تو میری تقریر مکمل طور پر سینسر کرنے کا فیصلہ کیا ہی ہوگا۔

اس ایک مثال سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ میڈیا کو کس حد تک اور کس طرح کنٹرول کیا جاتا ہے۔ صرف حکومت ہی نہیں، بلکہ اخبارات اور چینلز کے مالکان بھی مواد کو ایڈٹ کرنے کے نام پر سینسر کرتے ہیں۔ مدیران اور نائب مدیران بھی چاہیں تو مواد کو سینسر کر سکتے ہیں۔ ایسے میں پریس کی آزادی کی بات کرنا سادہ لوحی پر ہی محمول کیا جا سکتا ہے۔

عراق میں جاری جنگ کے ذریعے پہلی مرتبہ embedded reporting دیکھنے کو ملی ہے۔ امریکی فوج کے ساتھ سفر کرنے والے رپورٹر اور تجزیہ نگار ہر معاملے کو ایک خاص زاویے سے دیکھتے اور دکھاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں تصویر کا صرف ایک رخ سامنے آ سکتا ہے، اور آ رہا ہے۔ امریکی فوج کے ساتھ سفر کرنے والے رپورٹر اور تجزیہ نگاروں کے ذریعے عراقیوں کی مشکلات عمدگی سے طشت از بام نہیں ہو سکی ہیں۔ اس معاملے میں بی بی سی نے خاصا عمدہ کردار ادا کیا ہے۔ بی بی سی نے معروضیت برقرار رکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ دوسری طرف وائس آف امریکا کا انداز خاصا جانب دارانہ رہا ہے۔

عرب میڈیا میں بھی جانب داری دکھائی دیتی ہے۔ الجزیرہ کی رپورٹنگ کو خالص معروضی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ امریکی اور عرب میڈیا کو متوازن رہتے ہوئے کام کرنا چاہیے۔ الجزیرہ کو اس کے ایجنڈے نے گرفت میں لے رکھا ہے۔ آزاد اور خود مختار پریس وہ ہے جس میں ہر شخص کو اپنی رائے ظاہر کرنے کا حق ملے۔ اس معیار کے تناظر میں کسی بھی پریس کو آزاد قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اخبارات کے مدیران طے کرتے ہیں کہ کسی بھی چیز کو کس طرح شائع ہونا چاہیے۔ لکھنے والوں کے حقوق پر شب خون مارا جاتا ہے۔ صرف تعلیم کے ذریعے ہی لوگوں کو یہ جاننے کا موقع دیا جا سکتا ہے کہ صحیح ہے اور کیا غلط۔ سب کچھ شائع ہونا چاہیے، تاکہ لوگ خود فیصلہ کریں کہ کون حق بہ جانب ہے۔ (ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"Achieving true globalization".
(Based on Mahathir Mohammed's views.
written and edited by Dr. Kohei Hashimoto)